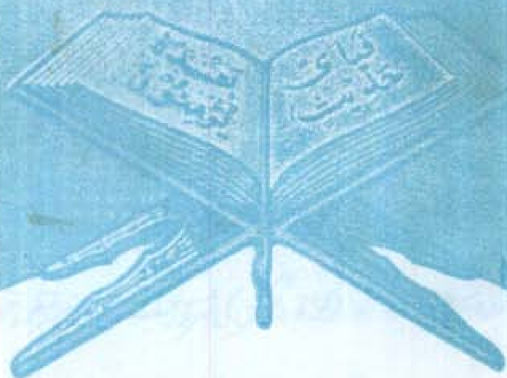
محدّث

وَدَاعِیاً اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ
وَسِرَاجاً مُّنِیْراً

٦٩



مجلس التحقیق الاسلامی گارڈن ٹاؤن لاہور

مدیرِ اعلیٰ
حافظ عبدالرحمٰن مدنی

ماہنامہ محدث لاہور

ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارُف

مُدیر اعلیٰ: حافظ عبدالرحمٰن مدنی مُدیر: ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے - جس کا نام محدث تھا- کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیمِ ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین ودانشور حافظ عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ نے اس کا اِجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ ۱۹۷۰ء سے اب تک کامیابی وکامرانی سے شائع ہورہاہے، وللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحبِ علم وفضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور ملحدانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گھر بیٹھے 'محدث' وصول کیجئے!

قارئین کرام! گھر بیٹھے محدث حاصل کرنے کیلئے درج ذیل طریقہ کار اختیار کریں!

فی شمارہ: ۲۰روپے زرِ سالانہ: ۲۰۰روپے بیرون ملک: ۲۰ڈالر

بذریعہ منی آرڈر ربینک ڈرافٹ ۲۰۰روپے بھیج کر سال بھر گھر بیٹھے محدث وصول کریں اور علمی و تحقیقی مضامین سے استفادہ کریں۔ ایڈریس: ماہنامہ محدث، ۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰

فون نمبر: 042 - 3586639 / 35866476 موبائل: 0305 - 4600861

انٹرنیٹ پر محدث پڑھنے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کیلئے درج ذیل ویب سائٹ دیکھئے!

www.mohaddis.com __ www.kitabosunnat.com

مزید تفصیلات کیلئے: webmaster@kitabosunnat.com

اجرائے مُحدث کے مقاصد

☜ عناد اور تعصّب قوم کیلئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں!

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

☜ علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

☜ غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے!

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سر انجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

☜ تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالح دینیہ کے خلاف ہے!

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین و مسائل اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

☜ آئین وسیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے!

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تورہ جاتی ہے چنگیزی۔

☜ جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے!

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ **مُحدّث** لاہور

کا مطالعہ فرمایئے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!

کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلّہ

ماہنامہ

محدّث

لاہور

جلد ۹	ذوالقعدہ والحجہ ۱۳۹۹ھ	عدد ۱۱، ۱۲

فہرست مضامین

ناشر: حافظ عبدالرحمٰن مدنی طابع: چوہدری رشید احمد مطبع: مکتبہ جدید پریس - ۴ شارع فاطمہ جناح لاہور

زرِ سالانہ -/۱۵ روپے فی پرچہ -/۲ روپے

فکر و نظر

بسم اللہ الرحمان الرحیم

نفاذ شریعت میں مسجدی قیادت کا عملی کردار

نفاذ شریعت میں متعدد عملی اقدامات کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ عملی اقدامات سے مراد ایسی موزوں تدبیریں ہیں جن سے شرعی احکام کی تعمیل میں سہولت ہوتی ہے اور ان کی خلاف ورزی کے امکانات کا قبل از وقت سدباب ہوتا ہے۔ موثر عملی اقدامات کے بغیر نفاذ شریعت کی انقلابی تحریک کا ثمر آور ہونا محال ہے۔

عملی اقدامات کے دو واضح مقاصد

نفاذ شریعت کے لیے بنیادی عملی اقدامات کے دو واضح مقاصد یہ ہیں:

اول: زندگی کے جملہ چھوٹے بڑے شعبوں میں مختلف عملی طریقوں سے شرعی احکام کو اس خوش اسلوبی سے نافذ کرنا کہ اتباع شریعت کی ضرورت اور افادیت کو ہر خاص و عام کی دلی تائید حاصل ہو جائے۔ یعنی ہر فرد انہیں اپنی روزمرہ زندگی میں برضا و رغبت اپناتا چلا جائے۔

دوم: ایسے موثر اور جچے تلے عملی اقدام اٹھانا کہ احکام شریعت سے خواہ مخواہ خائف یا بدگماں ہونے والوں کے تمام شکوک و شبہات کا مناسب مداوا ہوتا چلا جائے۔

مجوزہ اقدامات کے لیے سائنسی تیاری

عملی اقدامات کی منصوبہ بندی اور ان کی موثر تعمیل کے لیے ہر سطح پر باضابطہ تیاری ناگزیر ہے۔ یہ تیاری قانونی اور غیر قانونی، چھوٹی اور بڑی سطوح پر لازمی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تیاری کا یہ سارا سلسلہ یوں انجام پذیر ہو کہ ہر خاص و عام میں نفاذ شریعت کے لیے صحیح جذبہ، صحیح رجحان اور صحیح عمل خاطر خواہ طریق سے فروغ پائے اور اتباع شریعت فکر و عمل کا فطری لازمہ بنتا چلا جائے۔

مسجدی قیادت کے بنیادی فرائض

نفاذ شریعت کے ہر پہلو میں مسجدی قیادت کو محوری اور مرکزی حیثیت حاصل ہونی چاہیے۔ مسجدی قیادت کے کردار کو دو شعبوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اول: معالجاتی کردار

دوم: احتیاطی کردار

معالجاتی کردار کا دائرۂ اختیار

شرعی احکام کے مؤثر نفاذ اور غیر شرعی افعال کے علاج و استیصال کو مسجدی قیادت کا معالجاتی کردار کہا جا سکتا ہے۔ اس کردار کی مؤثر ادائیگی کے لیے سب سے پہلے یہ امر ضروری ہے کہ ملک کی تمام مساجد کے متعلقہ دائرۂ اختیار متعین کر دیئے جائیں۔ یعنی اس امر کا حتمی فیصلہ کر لیا جائے کہ وطن کی ہر مسجد کا حلقۂ اثر کس گاؤں، کتنے گلی بازار یا محلے کے کتنے مکانوں کی کتنی آبادی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طرح سارے ملک کو باضابطہ طور پر مسجدی علاقوں میں شمار کر لینے کے بعد ہر مسجد کو اپنے مخصوص حلقہ میں مندرجہ ذیل اختیارات استعمال کرنے کا آئینی طور پر مجاز قرار دے دیا جائے:

(الف) اپنے حلقۂ اختیار کے چھوٹے موٹے مقدموں، تنازعوں، معاملوں وغیرہ کے لیے کسی مقامی عدالت خفیفہ کا کردار،

(ب) مسجدی علاقے میں ہونے والی خوشی اور غمی کی مجالس کا انعقاد، یعنی نکاح اور انتقال وغیرہ کی مجالس کو احکامِ شریعت کے مطابق انجام پذیر ہونے کا اہتمام کرنا۔

(ج) مسجدی علاقہ میں امن برقرار رکھنے اور ہنگامی حالات سے پیدا شدہ مسائل سے نمٹنے کا مرکز وغیرہ۔

ان معالجاتی اقدام سے لوگوں کو اپنی قریبی مسجد میں سستا اور فوری انصاف اور اپنے روزمرہ مسائل کا مؤثر علاج میسر آ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی مسجدی علاقے میں امن و امان کی صورتِ حال بھی سدھر جائے گی۔

احتیاطی کردار کے چند پہلو

بجا طور پر کہا گیا ہے کہ "پرہیز علاج سے بدرجہا بہتر ہے" اس لیے شرعی احکام کی خلاف ورزی

کے بعد ہی حرکت میں آنے کی بجائے مسجد کی قیادت کو ایسے احتیاطی اقدام اٹھاتے پر خصوصی توجہ دینی چاہیے جن سے شریعت کی خلاف ورزی کے مواقع پیدا ہی نہ ہوں یا ان میں خاطر خواہ کمی واقع ہو۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل احتیاطی اقدام مؤثر ثابت ہو سکتے ہیں۔

۱۔ شرعی قوانین و ضوابط کی مؤثر تفہیم و اشاعت۔

۲۔ مسجد سے ملحق مفید اداروں کا قیام۔

۳۔ اندرون مسجد تعمیری مشاغل کی ترویج۔

۴۔ مسجد کے گردونواح میں تعمیری مشاغل کی تنظیم۔

۱۔ شرعی قوانین و ضوابط کی مؤثر تفہیم و اشاعت:

اس غرض کے حصول کے لیے خطبات جمعہ میں اختلافی مسائل اور فضول جذباتیت سے اجتناب پر زور دیا جائے اور اس کی بجائے روزمرہ زندگی سنوارنے کے لیے اسلامی اصولوں کی مؤثر نشر و اشاعت کی جائے۔ اس کے علاوہ مسجد میں گاہے گاہے خصوصی مجالس منعقد کی جائیں جن میں کسی نہ کسی رنگ میں اسلامی انداز حیات کو اپنانے کی ضرورت اور افادیت ذہن نشین کرائی جائے۔

۲۔ مسجد سے ملحق مفید اداروں کا قیام:

مسجد کو نمازوں کی ادائیگی تک ہی محدود کر دینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ سنہری تاریخ میں مسجد نے ہمیشہ زندگی کے تمام شعبوں میں تیاری کے سامان فراہم کیے ہیں۔ مسجد کے اس کردار کے احیاء کی ضرورت ملت اسلامیہ کو آج شاید پہلے سے کہیں زیادہ ہے اور یہ بات تبھی ممکن ہے جب مسجد کے ساتھ یا ارد گرد اس قسم کے تعمیری اداروں کی بنا بھی ڈال دی جائے۔ مثلاً: کتب خانہ، شفاخانہ، بیکاروں اور ناداروں کی فنی تربیت کا ادارہ وغیرہ۔ مسجد سے ملحق تعمیری سے یہ ادارے ملی ضرورتوں کو مؤثر طریقے سے پورا کر کے عامۃ الناس میں احکام شریعت کے اتباع اور خلاف ورزی سے اجتناب کے صحت مند رجحان کو فروغ دینے میں مفید ثابت ہوں گے۔

۳۔ اندرونِ مسجد تعمیری مشاغل کی ترویج:

متعدد مساجد میں فرض نمازوں کے علاوہ اسکے دیگر تعمیری مشاغل کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ مگر اکثر حساس مسلمانوں کو یہ شکایت بھی ہے کہ کئی مساجد میں یا تو فرض نمازوں کے سوا کچھ نہیں

ہوتا یا پھر اختلافی مسائل پر جارحانہ بحثیں اور مخالف مسلک پر کیچڑ اچھالنے کا دور دورہ رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مسجد میں اس قسم کی حرکات کا ارتکاب نہایت غیر مستحسن ہے۔ اس کی بجائے مساجد میں تعمیری مشاغل کو فروغ دینا ضروری ہے۔ مثلاً قرأت کی تربیت اور مقابلے، خطابت کی تربیت، حمد و نعت کی مجالس، تعلیم بالغان کی جماعتیں، محلہ کی اصلاحی مجلس کے اجلاس وغیرہ۔ اس قسم کے تعمیری مشاغل میں شمولیت سے اسفل جذبات کی تصعید ہوتی ہے اور یوں انسان احکامِ شرعی کی خلاف ورزی کی ترغیب یا ارتکاب سے محفوظ رہتا ہے۔

۴۔ مسجد کے گرد و نواح میں تعمیری مشاغل کی تنظیم:

تعمیری مشاغل کا دائرۂ تنظیم مسجد کی چار دیواری ہی نہیں بلکہ مسجد کا گرد و نواح بھی ہونا چاہیئے۔ چنانچہ مسجد کے ارد گرد کے علاقہ میں اس قسم کے تعمیری مشاغل کا اہتمام ہو سکتا ہے:

(الف) امام مسجد کی زیرِ قیادت اور مسجدی مجلس کے تعاون سے صحت و صفائی کی منظم مہمیں،

(ب) بچوں اور نوجوانوں کے لیے متوازن تفریحات کا اہتمام،

(ج) تمباکو نوشی اور دیگر قبیح عادات و رجحانات کے سدّ باب کے عملی منصوبے،

(د) بیکاری اور افلاس کے علاج کے لیے موثر اقدام، وغیرہ وغیرہ۔

یہ تمام تعمیری مشاغل مسجدی قیادت کے زیرِ اہتمام ہوں گے۔ مجوزہ اقدامات سے مسجدی علاقہ میں نئی زندگی، نیا ولولہ جنم لے گا۔ جس سے جرم و عصیاں کی جڑیں کٹتی چلی جائیں گی اور مسجدی علاقہ کے عوام میں اتباعِ شریعت کا رجحان خود بخود راسخ ہوتا چلا جائے گا۔

اجتہاد اور تخلیقیت ناگزیر ہے

ظاہر ہے کہ جب تک مسجدی قیادت ان نئی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پوری طرح تیار نہیں ہوتی اس وقت تک نفاذِ شریعت کے خواب کا شرمندۂ تعبیر ہونا محال ہے۔ اب جب کہ نفاذِ شریعت کا امید افزا اعلان کیا جا چکا ہے اور ہر چھوٹا بڑا اتباعِ شریعت پر آمادہ نظر آتا ہے، اس امر کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کی جا رہی ہے کہ مسجد اس سلسلہ میں اپنا مرکزی کردار خوش اسلوبی سے ادا کرے۔ اس کی واحد صورت موثر اور بامقصد عمل ہے، جس کے لیے تعمیرِ سیرت و کردار کے جدید طریقوں کا دانشمندانہ استعمال ناگزیر ہے۔

الغرض نفاذِ شریعت کے لیے اجتہاد اور تخلیقیت کے بغیر کسی قسم کی کامیابی قطعی ناممکن ہے۔ ویسے بھی دنیا کے تہی دست افراد کی حیثیت سے ہم دقیانوسی طریقوں کے مسموم عواقب کے مزید متحمل نہیں ہو سکتے۔

مولانا عزیز زبیدی ۔ واربرٹن (شیخوپورہ)

الکتاب والحکمۃ

آپ اپنی ڈیوٹی دیں، انجام خدا کے حوالے!

اصلی کمی

دنیا میں کمی مخلص کارکنوں اور اچھی تحریکوں کی نہیں ہے، چپہ چپہ پر آپ کو ملیں گی، اور ہر سر اس کا سودائی نظر آئے گا۔ ہاں کمی اگر ہے تو "کار خیر" شروع کر کے اس کو نباہ دینے کی ہے۔ لوگ عموماً بڑی گرمجوشی، ولولہ آتشیں اور بے قابو جذبۂ نیک کے ساتھ طوفان بن کر ابھرتے ہیں مگر ہمارے دیکھتے دیکھتے، وہ ابھر کر جھاگ کی طرح بیٹھ بھی جاتے ہیں ——

ذرا سوچیئے!

سوچنا یہ ہے کہ جب جذبہ نیک ہوتا ہے تو پھر الٹی زقند لگانے اور رجعت قہقری اختیار کرنے کے کیا معنی؟ اور آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ کہ یہ راہی نہ صرف اپنا سفر روک لیتا ہے، بلکہ بسا اوقات اپنی سمت بھی بدل لیتا ہے؟ آپ نے بارہا دیکھا ہو گا کہ بہت سے افراد جو کبھی کار خیر میں پیش پیش تھے، اب اسی کی راہ میں روڑا بھی بن رہے ہیں۔

کالی بھیڑیے

اصل بات یہ ہے کہ، یہاں پر ان کالی بھیڑوں کا تو ذکر ہی فضول ہے، جو سوء اتفاق سے ان اچھی تحریکوں میں آگھسے تھے، نیکی و بدی کا خاص تصور تو لے کر نہیں آئے تھے، ہاں جذبۂ نیک کے "واہمہ" میں ضرور مبتلا تھے، یا بقول حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فطرتاً چور تھے، پاسباں کے بھیس میں آگئے تھے:

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کسی نے حضرت مرشد تھانویؒ سے پوچھا کہ "جناب! بعض عالم اور طالب علم ہو کر چوری کرتے ہیں، ایسا کیوں ہوتا ہے، جبکہ وہ نیک اور عالم سمجھے جاتے ہیں"؟ انہوں نے اس کا جواب دیا کہ "یوں نہ کہو کہ عالم چور ہو گیا ہے بلکہ یوں کہو کہ، چور تھا، عالم بن کر آیا ہے۔" (اوکما قال)

قابلِ رحم

یہاں پر رونا ان بدنصیب لوگوں کا ہے، جو واقعۃً نیک تھے، اور اسی پاک جذبہ کے ساتھ داخل ہوئے تھے، مگر یہ راہی تھوڑی سی مسافت طے کرنے کے بعد، مایوسی کی نذر ہو گئے۔ یا تھک ہار کر توڑ

گوشۂ تنہائی میں جاکر روپوش ہوگئے یا ردِ عمل کے طور پر ادھر ادھر کی تحریکوں میں جاکر اپنے آپ کو بہلاتے رہے ۔۔۔ تمام محاسن اور خوبیوں کے باوجود آخر یہ لوگ ان حادثوں کا شکار کیوں ہو جاتے ہیں ؟ اصل میں اس کے متعدد اسباب ہیں، کچھ یہ ہیں:

احساسِ ناکامی

اس ٹیم کو سب سے پہلا اور مایوسی کا جو جھٹکا لگتا ہے وہ ناکامی کے احساس کا ہے مدتوں کی محنت کے بعد جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ جہاں سے چلے تھے، برسوں کے بعد بھی ابھی وہاں کھڑے ہیں، تو ان کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور بدحواس ہو کر بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔

آپ کا کام ڈیوٹی ہے، اس کے نتائج نہیں

کارِ خیر میں حصہ لینے والے عموماً اس خوش فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ جب ہم کام شروع کریں گے تو ضرور ہی میدان مار لیں گے، لیکن جب وہ اس میں ناکام رہتے ہیں تو حوصلہ ہار جاتے ہیں۔ برعکس اگر سوچ کا یہ انداز بدل جائے تو وہ ہزار ناکامیوں کے باوجود بھی ہمیشہ تازہ دم دکھائی دیں۔

بندۂ مومن کے ذمہ صرف ڈیوٹی ہے، اس کے نتائج نہیں ہیں اسے تو بس کام کرنا ہے، پوری نیک نیتی اور پورے حزم و احتیاط کے ساتھ کرنا ہے، اس کے بعد اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے ؟ اس کی باز پرس آپ سے نہیں ہوگی، کیونکہ نتائج کا ظہور اُس کے بس میں ہے آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔

قرآن کریم نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے فرمایا ہے:

"فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ" (پ۵ النساء ع ۱۱)

"آپ راہِ خدا میں جہاد جاری رکھیں، آپ صرف اپنی جان کے ذمہ دار ہیں (ہاں) مسلمانوں کو گرمائے رکھیں"

باقی رہے نتائج ؟ سو فرمایا:

"إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ ۚ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ" (پ۲۰ القصص ع ۶)

"آپ جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے ہاں اللہ جسے چاہے ہدایت دیتا ہے (کیونکہ) وہی بہتر جانتا ہے کہ کون راہ پر آنے والا ہے"

دراصل نتائج، استحقاق کا حاصل ہیں، اور یہ پیمانہ اس کے ہاتھ میں ہے کہ کون کس شے کے قابل ہے اور کس کی محنت کس ثمرہ کے لائق ہے ۔۔۔ کیونکہ یہ دار العمل ہے، اعمال کا بدلہ اگر صرف

داد و دہش اور فضل و کرم پر ہو تو وہ بات اور ہے، اگر ٹھیک ٹھیک بدلہ کی بات ہے تو یہ ہم نہیں جانتے کہ ہم نے جتنی اور جیسی کچھ محنت کی ہے اس میں اپنے نتائج پر کمندیں ڈالنے کی کتنی صلاحیت ہے۔!

ہر حال ہم نے ایسا صالح عنصر بکثیر دیکھا ہے جو اس حقیقت کو نہ سمجھ سکنے کی وجہ سے اچھے پروگراموں سے الگ ہو کر ہمیشہ کے لیے ضائع ہو گیا۔

طریق کار کا اختلاف

"کارِ خیر" میں شریک ان افراد اور گروپ کے لیے یہ مرحلہ بھی سخت ابتلاء کا مرحلہ ہوتا ہے جو طریق کار میں اختلاف کی بنا پر اختلافی نوٹ کے اظہار پر اکتفا کرنے کے بجائے پوری تخریبی مساعی کے ساتھ دوسرے ابنائے سفر اور رفقائے قافلہ سے علیحدگی کو "دینی جہاد" تصور کر لیتا ہے۔ حالانکہ جماعتی اور ملی وحدت" کی آبرو اور مستقبل کا احساس سب سے اہم دینی فریضہ ہے۔ اس لیے اسلام میں محض چند اختلافی عوامل کی بنا پر پوری جماعتی اور ملی تنظیم کے بخیے ادھیڑ کر ملتِ اسلامیہ کی وحدت کو نقصان پہنچانا سب سے بڑی کافری تصور کیا گیا ہے۔ (مشکوٰۃ)

قرآن کریم میں حکم ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بہر حال باخدا لوگوں کے ساتھ رہیں، چنانچہ فرمایا: "وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ" الآیۃ۔

"یعنی اے پیغمبر! جو لوگ صبح و شام اپنے رب کو پکارتے اور اسی کی رضامندی چاہتے ہیں، ان کے ساتھ رہنے پر اپنے آپ کو مجبور کرو!"

مقصد یہ ہے کہ: باخدا لوگ جو بہر حال اقامتِ دین کے لیے اٹھے ہیں، ان سے الگ ہو کر اقامتِ دین کے مستقبل کو نقصان نہ پہنچایا جائے، فروگذاشتیں سب سے ممکن ہیں لیکن جماعتی شیرازہ بندی میں رخنہ سب سے بڑی فروگذاشت ہے۔ گھر میں بھی آخر اختلافات ہو جاتے ہیں لیکن گھر کو کوئی چھوڑتا نہیں ہے بہر حال یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اقامتِ دین کی ان داعی جماعتوں کے زوال کا باعث یہی برخود غلط "جذبۂ نیک" رہا ہے، یعنی کارِ خیر کا شکار جذبۂ خیر کی چھری سے ہوتا آرہا ہے۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ رہبر سل اور نیکیوں کی یہ نیک بھول کب تک جاری رہے گی؟

راہِ حق کے مصائب

راہِ حق میں جو مصائب پیش آتے ہیں وہ حد درجہ حوصلہ شکن اور صبر آزما ہوتے ہیں، اس لیے یہ منزل جب آتی ہے تو عموماً دنیا حق کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے، حالانکہ اگر وہ ثابت قدم رہتے تو دنیا بالآخر ان کے قدم چومتی، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

"فَاصْبِرْ ۖ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ" (پ ۱۲ هود ع)

"صبر سے کام لیجیے! بالآخر پرہیزگاروں کا انجام بھلا ہوتا ہے"۔ صبر کے معنے ہیں، "ہمت نہ ہاریں" حالات اور وقت کے مناسب جو ہو، وہ تدابیر اختیار کریں، اور اپنا سفر جاری رکھیں، شرط یہ ہے کہ یہ سفر، سفر الی اللہ ہو:

"فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ" (پ ۱۶ مریم، ع ۱)

"اسی کا غلام ہو کر رہ اور اس کی بندگی پر ثابت قدم رہ"

رہی یہ فکر کہ کہیں مصائب کے ان چکروں میں وہ فنا نہ ہو جائے، تو فرمایا:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (پ ۲۷ طور ع)

"آپ اپنے رب کے حکم کے لیے چشم براہ رہیں، آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں"۔

یعنی آپ کو ضائع نہیں ہونے دیا جائے گا۔ آپ پورے اعتماد اور حوصلہ کے ساتھ بے فکر ہو کر کام جاری رکھیں۔

راہ کی مشکلات دراصل بندۂ مسلم کو کندن بناتی ہیں کھلتی اور مسلتی نہیں ہیں ؎

ساز بیدار ہوتا ہے اسی مضراب سے

حضرت خباب بن الارت (ف ۳۷ھ) قدیم الاسلام صحابی ہیں، راہ حق میں شدائد و مصائب کی اتنی اذیتیں برداشت کیں کہ الامان والحفیظ! وہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے درخواست کی کہ کیا آپ ہمارے لیے اللہ سے دعا نہیں مانگیں گے"؟ آپ نے فرمایا: "تم ابھی سے گھبرا گئے ہو، حالانکہ تم سے پہلے یہ کیفیت تھی کہ:

گڑھا کھود کر انسان کو اس میں گاڑ دیتے، پھر آرہ لا کر اسے چیر ڈالتے اور لوہے کی کنگھی سے اس کے بدن کا ماس نوچ لیتے تھے۔ "وَمَا يَصُدُّهُ ذَلِكَ عَنْ دِينِهِ" ... لیکن اسے یہ اذیتیں دینِ حق سے منحرف نہ کر سکتی تھیں، بخدا! یہ تحریک کامیاب ہو گی، صنعاء سے حضر موت تک تنہا سفر کرے گی مگر اللہ کے سوا اس کو اور کوئی خوف نہیں ہو گا مگر افسوس، تم جلدی کرتے ہو۔" (بخاری۔ کتاب المناقب)

حضرت خبیبؓ کا واقعہ مشہور ہے، قریش نے انہیں ایک درخت سے لٹکا دیا پھر نیزوں اور انی بھالوں سے انہیں چھید چھید کر شہید کیا، حضرت سعید بن عامرؓ نے یہ سارا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اسلام لانے کے بعد جب ان کو یہ واقعہ یاد آجاتا تو بیہوش ہو جاتے۔ (ابن ہشام)

جب کرب و اذیت کی گھڑی سر پر آئی تو حضرت خبیبؓ کی مبارک زبان سے نکلا بھی تو یہ نکلا:

وما ابالی حین اقتل مسلما — علی ای شق کان للہ مصرعی
وذلک فی ذات الالہ وان یشأ — یبارک علی اوصال شلو ممزع

"جب میں مسلمان ہو کر قتل کیا جا رہا ہوں تو اب مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ میں کس پہلو قتل ہو کر گرتا ہوں، یہ سب کچھ اللہ کی رضا کے لیے ہے۔ وہ چاہے گا تو میرے جسم کے پارہ پارہ ٹکڑوں پر اپنی برکتیں نازل فرمائے گا۔" بخاری کی روایت سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی یہ الفاظ منہ سے نکلے ہی تھے تو عقبہ بن حارث نے تلوار اٹھا کر ان کا سر قلم کر دیا (بخاری۔ کتاب المغازی)

حضرت زیدؓ بن دثنہ کو پھانسی دینے لگے تو حضرت ابوسفیانؓ جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے بولے "کیوں تمہارا جی چاہتا ہو گا کہ آج تمہاری جگہ محمدؐ ہوتے اور تم اپنے بال بچوں میں ہوتے؟ تو وہ بے چین ہو کر بولے:

"بخدا میں تو یہ بھی نہیں پسند کرتا کہ میری جان کے بدلے حضورؐ کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھے، ابوسفیان بولے، محمدؐ کے عاشق بھی نرالے عاشق ہیں۔ اس کے بعد نسطاس نے جو صفوان کا غلام تھا، آپؓ کو قتل کر دیا۔" (ابن سعد)

حضرت حرام بن ملحانؓ عامر بن طفیل کے پاس حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سفیر ہو کر پہنچے تو پہلے تو اس نے منافقانہ خوب آؤ بھگت کی پھر اشارہ کیا تو پیچھے سے ان کو نیزہ مار کر شہید کر دیا، جب آپ کے نیزہ لگا تو یہ صدا بلند ہوئی:

"اللہ اکبر! فزت ورب الکعبۃ!" (بخاری کتاب المغازی)

"اللہ سب سے بڑا ہے! رب کعبہ کی قسم میں جیت گیا!"

دراصل کار خیر اور اقامت دین کے کارکنوں میں نصب العین اور مقصد کے سلسلہ میں اس سرشاری کی کمی ہے۔ ورنہ تحریک سے علیحدگی اور گلے شکووں کا ہوش کہاں! بہرحال آپ کو ڈیوٹی دینی ہے۔ منزل مل گئی تو الحمد للہ، ورنہ سفر جاری رکھیں۔ اگر راہ میں مشکلات کا سامنا ہو جائے تو ان کو چوم کر آنکھوں پر رکھ لیں "جان رسد بہ جاناں یا جاں ز تن برآید" والی بات بن جائے، اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ دنیا اور آخرت ساری سرفرازیاں آپ کے قدم چومیں گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

❋ ❋ ❋

دارالافتاء

مولانا عزیز زبیدی

فتاویٰ

ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ:

(۱) ایک شخص ایک سے زیادہ قربانی دے سکتا ہے یا نہیں؟

(۲) اگر دے سکتا ہے تو سب ایک ہی دن کرے یا ایک آج، دوسری کل؟

(۳) چار بھائی ہوں تو وہ باری باری اگر کریں تو جائز ہوگا یا نہ؟

(۴) عید کا خطبہ بھی جمعہ کے خطبہ کی طرح پڑھا جاتا ہے یا صرف ایک ہی خطبہ ہوتا ہے؟ اس میں تکبیریں بھی پڑھنی چاہئیں یا نہ؟

(۵) شہر یا گاؤں سے باہر جا کر نمازِ عید پڑھنے کے بجائے اگر مسجد میں یا شہر میں پڑھ لے تو کیا حرج ہے؟ (ملخصاً)

الجواب

① ایک سے زیادہ قربانی | ہاں دے سکتا ہے:

(ا) "نحر النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم بیدہ سبعة بدن قیاما وضحی بالمدینة کبشین املحین اقرنین" (بخاری باب من نحر بیدہ)

(ب) قال علیؓ: لما نحر النبی صلی اللہ علیہ وسلم بدنه فنحر ثلاثین بیدہ وامرنی فنحرت سائرها" (ابوداؤد)

(ج) "ثم انصرف الی المنحر فنحر ثلاثا وستین بدنة بیدہ ثم اعطی علیا فنحر ما غبر" (رواہ مسلم عن جابر بن عبد اللہ باب حجة النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

ہاں اس میں اختلاف ہے کہ سات بکروں یا چھتروں کے عوض ایک گائے یا دس کے عوض ایک اونٹ کی قربانی دینا افضل ہے یا سات یا دس بکروں یا چھتروں کی قربانی بہتر ہے؟ ہمارے نزدیک دوسرا قول افضل ہے، کیونکہ آج کے دن اہراقِ دم (خون بہانا) زیادہ محبوب ہے اس لیے جتنی تعداد زیادہ ہوگی اتنی زیادہ فضیلت ہوگی۔ حدیث میں آتا ہے کہ قیامت میں قربانیاں اپنے سینگ، کھر اور بالوں سمیت خدا کے حضور لائی جائیں گی ظاہر ہے یہ تعداد ضرور رنگ لائے گی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ!

"ما عمل ابن آدم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اھراق الدم وانہ لیاتی یوم القیٰمۃ بقرونہا واشعارھا واظلافہا۔ الحدیث" (ترمذی عن عائشہؓ وقال ھذا حدیث حسن غریب باب ما جاء فی فضل الاضحیۃ)

۲۔ ایک آج دوسری کل

یہ ایک رسم بن گئی ہے کہ جن کے پاس ایک سے زیادہ قربانیاں ہوتی ہیں وہ ان کو قربانی کے مقررہ دنوں پر تقسیم کر لیتے ہیں نیتوں کا حال تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایسا اس لیے کرتے ہیں تاکہ کام و دہن کے چسکے کیلئے کچھ دن اور ہاتھ آجائیں اور روز دن اور تازہ گوشت مل جائے اس صورت میں ایسی قربانی کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہوتا ہے کیونکہ جب اس لالچ سے قربانی دی جاتی ہے تو وہ قربانی قربانی نہیں رہتی۔ عام گوشت والی بات بن جاتی ہے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تمنا پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ نماز عید سے پہلے جو قربانی دی گئی ہے اس کے بدلے اب ایک اور قربانی دیجیے! کیونکہ پہلی صرف اہل وعیال کے لیے ہوئی ہے:

"عن البراء قال سمعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب فقال ان اول ما نبدأ من یومنا ھذا ان نصلی ثم نرجع فننحر فمن فعل فقد اصاب سنتنا ومن نحر (قبل الصلوٰۃ) فانما ھو لحم یقدمہ لاھلہ لیس من النسک فی شیئ" (بخاری باب الذبح بعد الصلوٰۃ)

اگر یہ ذہن نہ بھی ہو تب بھی یہ طریقہ خلاف سنت ہے کیونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی دن سب کی قربانی کر دیتے تھے، اگلے دن پر نہیں چھوڑتے تھے۔ دو چھوڑ، خواہ بیسیوں ہو تیں۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں: گو یہ بات مساکین کیلئے تو خوب ہے مگر خلافِ سنت ہے کیونکہ حضورؐ نے ایک ہی دن میں سو قربانی دی تھی:

"قلت ھٰذا الذی قالہ (ای الرویانی) وان کان ارفق بالساکین الا انہ خلاف السنۃ فقد نحر النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی یوم واحد مائۃ بدنۃ اھداھا فالسنۃ التعجیل والمسارعۃ الی الخیرات والمبادرۃ بالصالحات الا ماثبت خلافہ" (روضۃ الطالبین کتاب الضحایا۔ فصل فی مسائل المنثورۃ)

نیز وہ فرماتے ہیں کہ: یہ ۶۳ وہ تھے جو مدینے سے لائے گئے تھے اور باقی وہ تھے جو یمن سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ پہنچے تھے (نووی شرح مسلم احدیث جابر بن عبداللہ باب حجۃ النبی صلعم)

امام بخاری نے باب ہی بڑا عجیب تجویز فرمایا ہے جس نے سارے مسئلے حل کر دیئے ہیں۔ باب یہ ہے "باب ما یشتھی من اللحم یوم النحر" یعنی قربانی کے دن گوشت کی خواہش کرنا"۔ یہ باب اس حدیث کے لیے مقرر فرمایا ہے جس میں عید کی نماز سے پہلے قربانی کر دینے کا ذکر ہے۔ کہ قربانی دینے میں اگر گوشت ہی کھانے کا جذبہ غالب ہے تو پھر وہ قربانی بے کار ہے کیونکہ یہاں مقصود بدل جاتا ہے۔ غرض: خدا کے حضور "اہراق

الدم "خون بہانا" ہے اگر اس کے بجائے کھانے کی بے چینیاں مچلنے لگی ہیں تو پھر سامنے پیٹ ہی آگیا خدا کے حضور نذرانہ نہ رہا!

۳۔ چار بھائی باری باری دیں

اس کی کیفیت بھی سوال ۲ "جیسی ہے۔ یعنی بظاہر اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ اس "باری باری" کے پس پردہ بھی "گوشت" کھانے کا جذبہ ہے کہ چار دن اور سلسلہ جاری رہ سکے اور تازہ بتازہ — اس لیے اس کا جواب بھی وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا ہے۔ کہ اس میں قربانی کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ ہاں انتظامی قسم کا تقاضا درپیش ہو تو پھر اور بات ہے۔

"انما الاعمال بالنیات" حدیث

بہتر ہے کہ حسبِ حال اپنے وقت پہ ان سب کو ہو جانا چاہیئے اس سے ایک تو گوشت غرباء تک زیادہ سے زیادہ پہنچ سکے گا۔ اور دوسرا "اہراق الدم" (خون بہانے) سے جو اصل مطلوب ہے، وہ حاصل ہو جائے گا اور وہ خون بہا کر راہِ خدا میں نذرانہ عقیدت اور جذباتِ فدویت کا ہدیہ پیش کرنا ہے۔

"لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۗؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ" (پ، الحج ع ۵)

خدا تک نہ تو ان کے گوشت پہنچتے ہیں اور نہ ان کے خون بلکہ اس تک تمہاری طرف سے تمہارا تقوٰی ہی پہنچتا ہے۔

"تقوٰے" کا لفظ اپنا نہ بڑی گہری تلمیح رکھتا ہے یعنی اس دن "گوشت" کے تصور کی مستی طاری نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ خدا کے حضور اپنی قربانی کا نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہوئے ان پر خشیت کی جو کیفیت طاری ہو سکتی ہے خدا کی نگاہ صرف اس پر ہوتی ہے۔ دراصل یہ قربانی اپنے اندر (۱) ایک عظیم تاریخ (۲) عظیم پس منظر اور (۳) ایک عظیم پیش نظر رکھتی ہے — یعنی (۱) یہ خلیل کا خدا کے حضور اپنی وفا کا ثبوت پیش کرنا ہے (۲) اب دل دھڑکتا ہے کہ کہیں قربانی رد نہ ہو جائے۔ نام و نمود یا مادی لالچ کی آمیزش سے وہ ضائع نہ ہو جائے (۳) اور یہ مال، اولاد کی قربانی کا بدل ہے اب یہ صورت ادعا کی بن گئی ہے کہ مال، اولاد اور جان تک دینے کی ضرورت پڑی تو اسے خدا دریغ نہیں کیا جائے گا۔

"اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ" کا یہی مفہوم ہے۔

خصوصاً "لَا شَرِيْكَ لَهٗ" کے دعوے نے تو دوسری ان تمام تحریکات کی نفی کر دی ہے جو کسی بھی درجہ میں "رضاء الٰہی، تہیا فدویت اور نذرانہ عقیدت" کے جذبات میں مخلوط ہو سکتی ہے — اس لیے اگر قربانی کے جانور کو اس "باری باری" سے آزاد رکھا جائے تو یہ بات "اخلاص اور احسان" کے جذبے

سے قریب تر ہوگی۔ انشاءاللہ۔ اور یہی مناسب ہے۔ سال بھر گوشت کھاتے رہتے ہیں۔ آج اگر خدا کے حضور گوشت کے تصور کے بجائے پوری خشیت اور جذبہ حنیفیت کے ساتھ اس کی خوشنودی کو ہی ملحوظ رکھنے پر اپنے جذبات کو انگیخت کیا جائے تو کیا ہی بہتر ہے۔ کیونکہ ادھر سے کچھ اسی قسم کی آوازیں آ رہی ہیں۔

"باری باری" کے بجائے اگر اپنی ایک سے زیادہ قربانیوں کو ایک ہی دن میں قربانی کر دے، اسی طرح اگر چند بھائی باہم باری دینے کے بجائے، سب بھائی ایک ہی دن میں قربانی دے دیں تو اس دن زیادہ سے زیادہ غرباء اور مساکین بھی استفادہ کر سکیں گے کیونکہ اس طرح ایک ہی گھر کے لیے گوشت کو سنبھالنا ویسے بھی مشکل ہو جائے گا، سنبھالنا ممکن ہو بھی جائے تو بھی اتنے وافر گوشت کی وجہ سے ضرور ہی دل بھر جائے گا اس لیے غریبوں کو بہت کچھ مل جائے گا۔ حضورؐ نے پہلے ذخیرہ کرنے اور بچا کر رکھنے سے منع کر دیا تھا کیونکہ غرباء رہ جاتے تھے، جب ان کو بھی وافر ملنے لگا تو آپ نے فرمایا کہ اب بچا کر رکھ سکتے ہو۔

"عن سلمة بن اكوع رضی الله عنه قال النبی صلی الله عليه وسلم من ضحی منكم فلا يصبحن بعد ثالثة وفی بيته منه شيئ فلما كان العام المقبل قالوا يارسول الله نفعل كما فعلنا الماضی قال كلوا واطعموا وادخروا فان ذلك العام كان بالناس جهد فاردت ان تعينوا فيها" (رواه البخاری باب ما يوكل من لحوم الاضاحی وفوق ثلاث لیتسع ذوالطول علی من لاطول له، ترمذی ص ۱۸۲)

ہمارے نزدیک وہ سب لوگ محتاج ہیں جو اس دن قربانی دینے کی سکت نہیں رکھتے، اگر اس دن بھی وہ گوشت سے محروم رہا یا ان کو کچھ ملے بھی تو "حسرتوں" کو مہمیز کرنے کے لیے تو اس دن قربانی دینے والے خدا کے ہاں جواب دہ ہوں گے۔ قرآنِ حکیم نے صاف اعلان کیا ہے کہ:

"فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ" (پ ۱۷۔ الحج ع ۵)

"پھر جب وہ کسی پہلو پر گر پڑیں (اور ٹھنڈے ہو جائیں) تو اس میں سے آپ بھی کھائیں اور سفید پوشوں اور منگتوں کو بھی کھلائیں!

قرآن حکیم میں یہ کہیں نہیں ہے کہ برابر حصے کرو۔ بلکہ یہ ہے کہ ان سے تین لوگ فائدہ اٹھائیں، (۱) قربانی دینے والے (۲) غیر مستطیع، سفید پوش اور (۳) سوالی لوگ ـــــ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ گھر کے دو، تین افراد محلہ بھر کے سفید پوشوں اور سوالی حضرات کی اتنی بھیڑ کے مقابلے میں برابر کے حصہ دار بن جائیں، کیونکہ یہ قربانیاں اب خدا کی ہیں، قربانی دینے والے کی نہیں ہیں، ان کا تعلق ان سے صرف اتنا ہے کہ انہوں نے قربانی

دی ہے۔ جیسے زکوٰۃ کو ادا کرنے کے بعد وہ اب خدا کی بن جاتی ہے ان کا نام صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ انہوں نے زکوٰۃ دی ہے۔ آیت میں صرف اتنا ہے کہ آپ بھی کھا سکتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں کہ ضرورت مند کی موجودگی میں آپ سارا ہڑپ کر سکتے ہیں یا ان کے مساوی آپ بھی برابر کے زمین حصے کر سکتے ہیں حاشا و کلا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کے لیئے اس سے استفادہ ممنوع نہیں ہے۔ اگر متعلقہ حلقہ میں ضرورت مندوں میں تقسیم کرنے پر صرف ایک ہی دن اور ایک ہی ٹائم کے لیے آپ کے لیئے سالن بن سکتا ہے تو پھر اتنے ہی پر اکتفا کیا جائے اور اتنا اتنا گوشت جتنے ضرورت مندوں تک آپ پہنچا سکتے ہیں آپ ضرور پہنچائیں اگر اب بھی کچھ لوگ بچ جائیں تو پھر آپ کی ذمہ داری ختم۔ ہاں یہ بات یاد رہے کہ ہمارے نزدیک گوشت سے غرباء کی تواضع ایک ضمنی ضرورت ہے اصل بات یہ ہے کہ وہ ایک فریضہ ہے اور وہ خدا کے حضور قربانی کے جانور کا خون بہانا ہے۔ ورنہ حج کے دنوں میں جہاں اکثر قربانیاں "دفن کر دی جاتی ہیں" تو وہاں قربانی بالکل نہ کی جاتیں۔ حالانکہ منکرینِ حدیث کے سوا اس کا اور کوئی شخص قائل نہیں، اس لیئے بنیادی طور پر یہ ضمنی حیثیت ہے، بھلا اسی میں ہے کہ "باری باری" دینے سے پرہیز کیا جائے تاکہ نذرانہ بے داغ رہے۔ واللہ اعلم!

۴ عید کے دو خطبے

اس کا بھی وہی مسئلہ ہے جو جمعہ کے خطبے کا ہے۔ درمیان میں قدرے بیٹھ کر پھر دوبارہ خطبہ دیا جائے۔ مندرجہ ذیل حدیث سے یہی بات مترشح ہوتی ہے:

"عن سعد بن ابی وقاصؓ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم صلی العید بغیر اذان ولا اقامۃ وکان یخطب خطبتین قائماً یفصل بینہما بجلسۃ" (مسند بزار) وقال النسائی فی کتاب العیدین: الجلوس بین الخطبتین والسکوت فیہ، عن جابر بن سمرۃ قال رایت النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب قائماً ثم یقعد قعدۃ لا یتکلم فیہا ثم قام فخطب خطبۃ اخریٰ الحدیث (ص۱۸۹) وقال القرأۃ فی الخطبۃ الثانیۃ والذکر فیہا: عن جابر بن سمرۃ قال کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یخطب قائماً ثم یجلس ثم یقوم ویقرأ الخ (ص۱۸۹)

گویا کہ امام نسائی علیہ الرحمۃ ان روایات سے عیدین کے لیئے بھی دو خطبے مستنبط فرماتے ہیں۔

"عن جابرؓ قال خرج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یوم فطر او اضحیٰ فخطب قائماً ثم قعد قعدۃ ثم قام" (ابن ماجۃ باب ما جاء فی الخطبۃ فی العیدین)

اس کا ایک راوی اسمٰعیل بن مسلم مکی خولانی ہے، جو ضعیف ہے اس پر اعتراض ہے کہ اس کے

حافظہ میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔

"قال یحییٰ کان لم یزل مختلطا" (میزان)

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

"کان فقیہا ضعیف الحدیث من الخامسۃ" (تقریب)

محشی صاحبِ تعقیب التقریب اس پر لکھتے ہیں:

"ضعیف الحدیث ای فی حفظہ" (تعقیب)

اس کا دوسرا راوی ابو بحر ہے جس کا نام عبد الرحمٰن ہے۔ حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

"ضعیف من التاسعۃ" (تقریب) لیکن علماء نے اس سے اتفاق نہیں کیا ان کا کہنا ہے کہ ایک فقہی نظریہ کی بنا پر اس پر طعن کیا گیا ہے۔ ورنہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے:

اقول لانہ روی حدیث النبیذ واھل البصرۃ تدینوا بتحریم النبیذ....... فظہر ان

من تکلم فیہ انما تکلم لحدیث النبیذ فالصواب انہ لا باس بہ (تعقیب التقریب)

اب اعتراض صرف اسمٰعیل بن مسلم کا رہ جاتا ہے لیکن دوسرے شواہد سے اس کی بھی تلافی ہو جاتی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ عیدین کے دن دو خطبے مسنون ہیں:

"عن ابن مسعود انہ قال: السنۃ ان یخطب فی العیدین خطبتین فیفصل بینھما

لجلوس، نصب الرایۃ ص ۲۲۱/۲)

امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ یہ منقطع روایت ہے۔ "ضعیف غیر متصل" (نصب الرایۃ ص ۲۲۱/۲) جیسا کہ عنقریب تفصیل آئے گی، مرسل ضعیف بھی ہو تو بھی تقویت کے لیے کافی ہوتی ہے۔ حضرت ابن مسعودؓ کے خاندان کے ایک فرد حضرت عبید اللہ بن عتبہ فرماتے ہیں، عیدین کے لیے مسنون دو خطبے ہیں:

"السنۃ ان یخطب الامام فی العیدین خطبتین یفصل بینھما بجلوس (مسند الشافعی)

اس میں امام شافعی کے استاذ ابن ابی یحییٰ ہیں جو بہت ہی ضعیف ہیں۔

مصنف عبد الرزاق میں ہے کہ عید کے دن منبر پر تکبیر کہنا سنت ہے۔ نو تکبیریں کہنے پر خطبہ شروع کرے پھر دوسرا خطبہ سات تکبیروں سے شروع کرے:

"السنۃ التکبیر علی المنبر یوم العید یبدأ خطبۃ الاولیٰ بتسع تکبیرات قبل

ان یخطب ویبدء الاخرۃ بسبع" (مصنف عبد الرزاق باب التکبیر فی الخطبۃ ص ۲۹۱/۳)

لیکن اس میں بھی وہی ابراہیم بن یحییٰ ہیں اس لیے یہ روایت بھی ضعیف ہے۔ ہاں ابن ابی شیبہ میں جو روایت آئی ہے وہ ا[illegible] آئی ہیں ہے۔

حدثنا ابوبکر قال حدثنا وکیع عن سفیان عن محمد بن عبد الرحمن القاری عن عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبۃ قال من السنۃ ان یکبر الامام علی المنبر علی العیدین تسعا قبل الخطبۃ وسبعا بعدھا (مصنف ابن ابی شیبۃ ص۱۹۰/۲ باب فی التکبیر علی المنبر)

قال الشوکانی: ولیس قول التابعی "من السنۃ" ظاھرا فی سنۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (نیل ص۲۵۹/۳) لیکن قال الحافظ: ونقل ابن عبد البر فیہ الاتفاق قال واذا قالہا غیر الصحابی فکذلک ما لم یضفہا الی صاحبہا وفی نسبتہا مرفوع (نزھۃ النظر ص۹۰) وقال فی الفتح: واجیب بان قول عروۃ وھو تابعی "السنۃ کذا" وان قلنا انہ مرسل علی الصحیح" (فتح الباری باب خطبۃ الامام فی الکسوف ص۵۶۲/۲)

بیہقی کی روایت کے یہ الفاظ ہیں:

"السنۃ ان تفتح الخطبۃ بتسع تکبیرات تترٰی والثانیۃ بسبع تکبیرات تترٰی" (بیہقی) ابن ابی شیبہ اور بیہقی کے اسانید مختلف ہیں۔

قال الحافظ ورواہ ابن ابی شیبۃ من وجہ اخر عن عبید اللہ (تلخیص الحبیر ص۱۴۵)

صحابی یا تابعی کا "من السنۃ" کہنا، حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔ قال الزیلعی واعلم ان لفظۃ السنۃ یدخل فی المرفوع عندھم قال ابن عبد البر فی التقصی: واعلم ان الصحابی اذا اطلق اسم السنۃ فالمراد بہ "سنۃ النبی" صلی اللہ علیہ وسلم وکذلک اذا اطلق غیرہ مالم یضف الی صاحبہا کقولھم "سنۃ العمرین" وما اشبہ ذلک" (نصب الرایۃ ص۳۱۴/۱)

یہ وہ روایات اور آثار ہیں، جو مجموعی لحاظ سے حسن لغیرہ کے درجہ میں ہیں کیونکہ ابن ماجہ والی روایت میں اسمٰعیل بن مسلم المکی پر جو جرح کی گئی ہے وہ ان کے حافظہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اصول حدیث میں یہ تصریح کی گئی ہے کہ اگر روایت کی تائید کسی دوسری ضعیف روایت سے بھی ہو جائے تو وہ حسن (لغیرہ) ہو جاتی ہے مثلاً ایک دیانت دار اور صدوق راوی کا حافظہ کمزور ہو تو ایک اور طریقے سے ایک اور روایت آجائے۔

"بل ما کان ضعفہ لضعف حفظ راویہ الصدوق الامین زال لمجیئہ من وجہ آخر وصار حسنا (تقریب النواوی ص۱۰۳) حدیث الضعیف للفسق لا یرتقی بتعدد الطرق الی الحجیۃ ولغیرہ یرتقی (التحریر ص۳۱۶)

خواہ وہ دوسری روایت ضعیف بھی ہو۔

"اذا وجد له طريق اخرفيه ضعف قريب محتمل ارتقى لمجموع ذالك الى درجة الحسن (تدريب ص۱۷۶) وكان دون الحسن لذاتہ" (تدريب)

اور حسن لغیرہ حجت ہوتی ہے:

"قال السخاوي في فتح المغيث، ان الحسن لغيره يلحق فيما يحتج به لكن فيما تكثر طرقه (قواعد التحديث ص۹۰) ولو وجها واحدا كما يشير اليه تعليل ابن الصلاح" (تدريب)

اگر ضعف تدلیس یا جہالت اور ارسال کی بنا پر تو وہ اگر دوسری سند سے آجائے خواہ وہ ویسی ہی ہو تو بھی ضعف منجبر ہو جاتا ہے۔

"وكذا اذا كان ضعفه للارسال زال بمجيئه من وجه الآخر" (تقريب للنووي)

امام سخاوی فرماتے ہیں کہ اس کے یہ معنے نہیں کہ یہ "ضعیف روایت" سے حجت پکڑی گئی ہے۔ بلکہ یہاں احتجاج مجموعی حیثیت سے ہے۔ جیسے ایک مرسل، دوسری مرسل سے خواہ ضعیف بھی ہو تائید ہو جائے تو وہ قابل احتجاج ہو جاتی ہے:

"ولا يقتضي ذلك الاحتجاج بالضعيف فان الاحتجاج انما هو بالهيئة المجموعة ما كالمرسل، حيث اعتضد بمرسل آخر ولو كان ضعيفا كما قاله الشافعي والجمهور"

(قواعد التحديث ص۹۰)

کیونکہ اس سے یہ ظن قوی ہو جاتا ہے کہ اب راوی کے حافظہ نے خطا نہیں کی:

"عرفنا بذلك انه قد حفظه ولم يختل فيه ضبطه" (تدريب الراوي ص۱۰۳) وقال ابن الهمام "بخلافه بسوء الحفظ لانه لوهم الغلط والتعدد يرجح انه اجاد فيه فيرتفع المانع (التحرير في اصول الفقه لابن الهمام ص۲۵۰) فلذا ارويناما رواه قد جاء من وجه آخر عرفنا انه مما قد حفظه ولم يختل فيه ضبطه له وكذلك اذا كان ضعفه من حيث الارسال زال بنحو ذلك (علوم الحديث لابن الصلاح ص۳۱)

بہرحال ضعاف کی تائید مرسل سے ہوتی ہے اور مرسل کی ضعیف سے، اس کے علاوہ تعدد طرق اور عموم کی تائید بھی اس کو حاصل ہے۔ امام نسائی کے صنیع سے معلوم ہوتا ہے کہ دو خطبے حضورؐ کے خطبوں کے معمولات میں سے تھے "کما مر"۔ باقی رہیں خطبے کے دوران یا پہلے یا آخر میں تحریریں؟

ہمارے نزدیک "اقرب الی الصواب" ان کا پڑھنا ہی ہے۔ دونوں خطبوں کے درمیان بیٹھنا، برائے فصل ہے یا استراحت؛ اس میں اختلاف ہے صحیح پہلا قول ہے۔

"واختلف في حكمتها فقيل للفصل بين الخطبتين وقيل للراحة..... (والاول) هو الظاهر

گاؤں یا اس سے باہر عیدین

حافظ ابن حجرؒ نے امام شافعیؒ کے ایک قول سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ شہر یا مسجد سے باہر جا کر نماز عید پڑھنا محض جگہ کی تنگی کی وجہ سے تھا۔ اگر سمائی ہو سکے تو پھر شہر اور مسجد میں پڑھی جائے تو اولیٰ ہے۔

ثم اشار (ای الشافعی) ان سبب ذلك سعة المسجد وضيق اطراف مكة قال في الام ... ... لو عمر بلد فكان مسجد اهله يسعهم في الاعياد لم ار ان يخرجوا منه فان كان لا يسعهم كرهت الصلوة فيه ولا اعادة ومقتضى هذا ان العلة تدور على الضيق والسعة لا لذات الخروج الى الصحراء لان المطلوب حصول عموم الاجتماع فاذا حصل في المسجد مع افضليته كان اولىٰ (فتح الباری ج ۲ ص ۵۲۱)

لیکن اس پس منظر اور فلسفہ کے لیے روایات میں کوئی لفظ نہیں ملتا اور نہ ہی سیاق کلام سے ایسی کوئی بات مترشح ہوتی ہے۔ اس کے بجائے اگر یہ کہا جائے کہ چار دیواری سے نکل کر جنگلوں، فضاؤں اور صحراؤں کو بھر دینے سے شوکتِ اسلام اور اہلِ اسلام کی نمائش بھی مقصود ہے، اس کے علاوہ عبادت اور ذکر الٰہی سے بے کراں فضاؤں کو معمور کرنے کے لیے ایک مناسب تقریب بھی ہے، تو بہتر ہے۔

بہر حال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور بعد میں خلفائے راشدین نے اس طرزِ عمل پر مداومت کر کے اس کی اس "انتظامی ضرورت" کی نفی کر دی ہے جس کی فتح الباری میں نشاندہی کی گئی ہے۔ حکمت یہ ہے کہ صحراؤں میں جا کر حضورؐ نماز عید پڑھا کرتے تھے آپؐ کا یہ اسوۂ حسنہ ہمارے نزدیک تمام حکمتوں سے بالاتر ہے۔

واستدل به على استحباب الخروج الى الصحراء لصلوة العيد وان ذلك افضل من صلاتها في المسجد لمواظبة النبي صلى الله عليه وسلم على ذلك مع فضل مسجده (فتح الباری ص ۵۲۱)

صحیح اور اصلی حکمت یہی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہی تعامل رہا ہے ہم نہیں جانتے کہ یہ بات جگہ کی تنگیٔ داماں کا نتیجہ تھی، یا فرض و واجب؟ ہم تو وہی بات کہیں گے جو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک سائل کے اس جواب میں کہی تھی کہ "کیا قربانی فرض ہے" تو آپؓ نے جواب دیا کہ "حضورؐ نے قربانی دی اور سب مسلمانوں نے بھی"۔ اس نے پھر بتکرار یہ سوال کیا تو آپؓ نے پھر یہی جواب دیا۔

"اواجبة هي؟ فقال ضحّى رسول الله صلى الله عليه وسلم والمسلمون"

فاعاد عليه فقال أتعقل ضحّى رسول الله ﷺ والمسلمون (رواه ...

[illegible] ص ۱۸۲)

زکوٰۃ و ٹیکس کی شرعی حیثیت

شمارہ ہذا میں دو مقالے "زکوٰۃ و ٹیکس کی شرعی حیثیت" کے بارے شائع کیے جا رہے ہیں جو محکمہ زراعت پنجاب کے شعبہ اطلاعات لاہور کے زیر اہتمام مجلس مذاکرہ میں پڑھے گئے۔ اگرچہ دونوں مقالہ نگار پروفیسر منظور احسن عباسی اور ڈاکٹر عبدالروف صاحبان اسلام کے پرخلوص شیدائی ہیں لیکن اپنے افکار میں زکوٰۃ و ٹیکس کو دو مختلف حیثیتوں سے دیکھ رہے ہیں۔ محدث کے مدیر اعلیٰ نے اسی مذاکرہ میں اسلام کے معاشی نظام کے بعض پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہوئے دونوں حضرات کے خیالات کا جائزہ بھی لیا تھا جو محدث کی کسی قریبی اشاعت میں پیش خدمت ہوگا۔ انشاء اللہ!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جناب صدر و معزز حاضرین

انسان کے اشرف المخلوقات ہونے سے کسی کو انکار نہیں بلکہ کوئی شخص انکار کر ہی نہیں سکتا کیونکہ ہم اپنی برہنہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ ملائکہ افلاک سے لے کر حشرات الارض تک ہر فرد اپنی بقائے شخصی و نوعی کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن اس سے ماورا ایک اور صلاحیت، جسے ہم ارتقائی صلاحیت کہتے ہیں، بجز انسان کے کسی اور مخلوق میں نہیں ہے اجرام و جمادات کا تو ذکر ہی کیا نہ کوئی فرشتہ اپنی صلاحیتوں میں ترقی کر سکا اور نہ کوئی جانور اپنے وظائفِ حیات میں کوئی تبدیلی لا سکا۔ چنانچہ ماہرین حیاتیات کا کہنا ہے کہ مثلاً بیا کا گھونسلہ حیرتناک صناعی کے باوجود اب بھی وہی ہے جو ہزار سال پہلے تھا لیکن انسان پتھر اور دھات کے زمانے سے گزر کر اب برقی اور جوہری عہد سے گزر رہا ہے۔ اور آئندہ نہیں۔۔ معلوم انسانی ارتقائی منازل کا آخری زینہ کونسا ہوگا

مجھے حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائیگی!

انسان کی ارتقائی صلاحیتیں خواہ کسی نوعیت کی ہوں اپنی تقویت یا تکمیل کے لیے چار قوتوں کی محتاج ہیں۔ یعنی ندرت، استقامت، ایثار، عزم۔ عہد حاضر کے

دانشمند ایسے

1 submission.
2 patience
3 sacrefice
4 Resolution

کہتے ہیں — ہماری دینی اصطلاح میں اسے خضوع، صبر، صدقہ اور یک جہتی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انسان کی تمام مادی اور روحانی ارتقا کارانہ یا روحِ حیات ان ہی چار صلاحیتوں پر منحصر ہے اور ہماری عبادتیں ان ہی محاسن فطری کی مظاہر ہیں۔ چنانچہ نماز کی تکمیل خضوع وخشوع پر، روزے کی تکمیل صبر واستقامت پر، زکوٰۃ کی تکمیل صدقہ وایثار پر اور حج کی تکمیل عزم واعتماد پر موقوف ہے۔ اللہ تعالےٰ کے تمام ارشادات (یا قرآن حکیم) اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جملہ تعلیمات (یا احادیث) کا مرکزِ ثقل یہی ہے۔

حیاتِ انسانی کی ان چہار گانہ صلاحیتوں کی صحت کا دارومدار ایک اور رشتے پر ہے جسے وحدانیت وتصورِ آخرت کہا جاتا ہے۔ یعنے جب تک کہ ان اعمالِ صالحہ کے ساتھ توحید الٰہی کا تصور نہ ہو۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سب بے معنی اور بے اثر ہیں۔ قرآنِ حکیم میں "ریاء" کی مذمت نہایت شدت سے آتی ہے۔ کیونکہ ریاء توحید الٰہی کے منافی ہے۔ ریاء اللہ کے تصور کو مٹا کر غیر اللہ کے تصور کو ابھارتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اہلِ ریاء کی عبادتوں کا مقصد، عبادتِ الٰہی کے مفہوم سے بالکل جداگانہ ہے۔ عبادات میں اگر محض طاعتِ حق پیش نظر نہ ہو بلکہ کوئی اور مقصد ہو تو وہی مقصد انسان کا معبود بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے تصورِ توحید کو سب پر مقدم رکھا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اعمالِ صلوٰۃ کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے لیکن پیش نظر مقصد صبح خیزی کی عادت ڈالنا، پابندیٔ اوقات، پاکیزگیٔ جسم، ہلکی ورزش، [illegible] چہل قدمی اور اہلِ محلہ یا اہلِ شہر سے ملنا جلنا، باہمی ہمدردی اور محبت واخلاص۔ اور نیک نیتی کے ساتھ جذبۂ ہمدردی کو فروغ دینا ہو، تب بھی اس سے نماز کے مادی فوائد تو حاصل ہو سکتے ہیں لیکن روحانی برکات جو نماز کا اصل مقصد ہے، وہ ہرگز حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ نماز کا حکم ان مقاصد میں سے کسی مقصد کے لیے نہیں ہے۔ کسی دینی عمل کے مادی نتیجے کو مقصد قرار دینا

اسلامی نظریہ کے منافی ہے نماز ہم صرف اس لیے پڑھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے یہ دوسری بات ہے کہ ہر حکم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی مادی فلاح بھی ملحوظ رکھی ہو جیسا کہ قرآنِ حکیم کی متعدد آیتوں سے مترشح ہوتا ہے۔ یہی حال دوسری عبادات کا بھی ہے۔

ملتِ اسلامیہ پاکستان کے سر دانش مندوں نے جن میں بعض مستند علماء و رہنما بھی شامل ہیں اسلامی عبادات کی برکات و فیوض کی تفصیلات بیان کی ہیں اور ان کو موجودہ وقت کے تقاضوں کا قطعی اور مکمل حل بتایا ہے یہاں تک کہ قرآنِ حکیم کے حکم اقامتِ صلوٰۃ کے معنے نظامِ زکوٰۃ کا قائم کرنا بتایا گیا اور اس نظامِ صلوٰۃ کے قیام کو جملہ امورِ معاشی معاشرتی اقتصادی اور سیاسی اداروں کی بنیاد قرار دیا اور اسی کے ساتھ ہی حفظانِ صحت کے محکموں . . . . . . کارخانوں اور بہم رسانیٔ آب کے وسائل کو منسلک فرمایا۔ جس سے ان اصحاب کی عقیدت مندی اور نیک نیتی کا اظہار تو ضرور ہوتا ہے لیکن یہ یقین کرنا مشکل ہو گا کہ فی الواقع نماز پڑھنے سے یہ مسائل حل ہو جائیں گے۔ اگر فی الواقع نماز کا اعجاز ان مسائل کو حل کر بھی دے تو یہ تصور قطعاً ناروا خوش فہمی ہے کہ نماز کے سوا کوئی اور ذریعہ ان مقاصد کا حل نہیں ہے۔ اگر اس کے دوسرے ذرائع بھی ہیں تو اللہ کے حکم اور خود ساختہ مادی وسائل میں فرق کرنے کی کیا ضرورت رہے گی؟

معزز جنابِ صدر و حاضرین! اب تک جو کچھ میں نے عرض کیا اس کی بظاہر عنوان مدعا سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ مجھے یہاں اسلامی حکمِ زکوٰۃ پر کچھ عرض کرنا تھا لیکن اس طوالتِ تمہید سے میری غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے جملہ احکام کو اس کی معبودیت کی روشنی میں دیکھنا ہی اصل بندگی و عبادت ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور جہت سے احکامِ الٰہی کی اہمیت کم تو نہیں ہوتی لیکن اصل مقصد سے دور کر دیتی ہے۔

زکوٰۃ کے بارے میں صرف ایک نکتہ کو بہرحال پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ زکوٰۃ کا حکم بھی نماز کی طرح ایک عبادت ہے۔ اس عبادت کی بجا آوری خواہ ہمارے تمام معاشرتی مسائل کو حل کر دے یا کسی حیثیت سے کہیں اس میں خسارہ جائے تب بھی یہ بہرحال واجب العمل ہے۔ اس کے بعد وہ تمام بحث کہ آیا نظامِ زکوٰۃ قوم کی غربت و افلاس کے مسائل کو کہاں تک حل کر سکتا ہے عبث ہے۔ پھر اس سلسلہ میں اس امر پر اظہارِ اطمینان کرنا کہ زکوٰۃ کی رقم موجودہ ٹیکسز کی رقم سے کئی گنا زیادہ ہو گی اسی طرح بیجا ہے جس طرح اقامتِ صلوٰۃ کے بعد ہیلتھ ٹائل بلز کو

فروغ حاصل ہونے کی توقع بیجا ہے۔ آیا کوئی مسلمان ادائیگی زکوٰۃ کرتے ہوئے یہ کیوں سوچے کہ اس کے بعد کہاں تک ملک کا افلاس دور ہو جائے گا اگر بالفرض وصولِ زکات کے بعد بھی ملک افلاس کا شکار رہے تو کیا حکومت کے لیے روا ہو گا کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہے گی کہ کہیں سے زکوٰۃ آئے تب ہی یہ مسئلہ حل ہو صدرِ مملکت نے اپنے بیان میں جو یہ کہا ہے کہ زکوٰۃ کے ساتھ دوسرے ٹیکسز بھی عائد رہیں گے اس کا یہی مطلب ہے۔ ادائیگی زکات کے لیے حکومت کے نظام کا یہ مقصد ہے کہ ہر شخص نماز کی طرح زکوٰۃ بھی ادا کرے اور وصول شدہ زکوٰۃ صرف مستحقین تک پہنچائے۔ یا اس امر کا اطمینان کرے کہ صاحبِ نصاب نے خود زکوٰۃ، مستحق شخص کو ادا کر دی ہے۔

فریضۂ زکوٰۃ کے متعلقہ مسائل کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے تاہم چند اہم زکات کا ذکر مناسب ہو گا مثلاً:

۱۔ کن اشخاص پر زکوٰۃ واجب ہے؟

۲۔ کن اشیاء (مال) پر اور کس قدر واجب ہے؟

۳۔ کن اشخاص کو زکوٰۃ لینے کا حق ہے؟

زکوٰۃ ہر اس مکلف مسلمان پر واجب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مال کا مالک بنایا ہو ارشادِ باری تعالیٰ "ومما رزقنٰھم ینفقون" کے یہی معنی ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے حجۃ الوداع کے شہرۂ آفاق خطبہ میں واشگاف الفاظ میں فرمایا "ادوا زکوٰۃ اموالکم" (یعنی لوگو اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کیا کرو!)

اموالِ زکوٰۃ میں یہ اشیاء داخل ہیں۔

ا۔ سونا، چاندی اور ان کی مصنوعات۔

ب۔ ہر گونہ اموالِ تجارت

ج۔ پالتو جانور۔

زراعت اور درختوں سے پیدا ہونے والی اجناس اور پھل شریعتِ اسلامیہ میں ان جملہ اشیاءِ زکوٰۃ کی وہ مقدارِ محدود بتا دی گئی ہے جس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اس طرح وہ وقت بھی متعین فرمایا گیا ہے کہ زکوٰۃ واجب الادا ہو جاتی ہے۔

مثلاً سونے کی مقدار ۷½ تولہ یا چاندی کی مقدار ۵۲½ تولہ ہے۔ یہ مقدار یا

اس سے زیادہ سال بھر تک مالک کے قبضہ میں رہی ہو، تو اس کا ۲/۱ ۲ حصہ زکوٰۃ میں دیا جائے گا۔ اور اس قیمت کے مالِ تجارت پر بھی اس عرصہ کے بعد زکوٰۃ عائد ہو گی۔ اس مقدار کو نصاب کہتے ہیں۔ اونٹ کا نصاب کم سے کم ۵ گائے بیل وغیرہ کا ۳۰ اور بھیڑ بکریوں کا ہے

زرعی پیداوار کا نصاب میرے حساب کے بموجب کم و بیش ۲۰ من ہے اور بموجب آیتِ قرآنی "وآتوا حقہ یوم حصادہ" یہ زکوٰۃ جسے عشر کہتے ہیں، اسی روز واجب الادا ہو جاتی ہے جس روز فصل کاٹی جائے۔ شریعتِ اسلامیہ نے ان تمام احکام کے عملی اقدامات کی ہر امکانی مشکل کو حل کر دیا ہے اور اب یہ صورت ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی اور فقہائے ملت کی رہنمائی میں اس پر عمل پیرا ہونے کے دستور العمل کو قانونی شکل دی جا سکتی ہے۔

اسلامی نظامِ عشر و زکوٰۃ کو عہدِ حاضر کی اصطلاح میں اسلام کے اقتصادی نظام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس عاجز کو اس اصطلاح سے چڑ نہیں ہے لیکن میں اس کو عبادتِ الٰہی کے خالص دینی مفہوم سے کم درجہ کی حیثیت میں سمجھتا ہوں کیونکہ اسلامی نظامِ اقتصاد کے مفہوم میں وہ عظمت پس منظر میں چلی جاتی ہے جو عبادتِ زکوٰۃ کے مفہوم میں ہے۔

معزز حضرات! آپ اسے کم فہمی کہہ سکتے ہیں لیکن بری بدگمانی دیکھیے کہ ملک کے دانشور حکمِ زکوٰۃ کو ایک بہترین اقتصادی نظام قرار دے کر اس کی جس قدر زیادہ تعریف کرتے ہیں، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے وہ کسی آئینی یا جمہوری مملکت کے اقتصادی نظام کا قصیدۂ مدحیہ پڑھ رہے ہوں۔ نظامِ زکوٰۃ کے مداحوں کی تقریریں اور مضامین اکثر نہایت شوق سے سنتا اور پڑھتا ہوں اور بے ساختہ سبحان اللہ بھی کہہ دیتا ہوں کیونکہ یہ اصحاب نہایت وضاحت سے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں کہ نظامِ زکوٰۃ انسانی ہمدردی اور بنی نوعِ انسان کی بہبود کا ضامن ہے، جہالت اور غربت کا علاج ہے۔ سرمایہ داری اور ذخیرہ اندوزی کا دشمن ہے اور انسان کے بنیادی حقوق کا محافظ ہے وغیرہ۔ لیکن محاسنِ زکوٰۃ کی اس فہرست میں اس عاجز کی نظر سے زکوٰۃ کی وہ صفت کہیں نہیں گزری کہ یہ عملِ خیر سب سے زیادہ خود زکوٰۃ گزار کو ہلاکت سے بچاتا ہے۔ حالانکہ قرآنِ حکیم میں زکوٰۃ کی یہی صفت آئی ہے کہ "انفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ واحسنوا ان اللہ یحب المحسنین" (البقرۃ ع ۲۴) کہ "راہِ خدا میں خرچ کرو اور اپنی ہستی کو ہلاک ہونے سے بچاؤ۔ احسان کرو، اللہ احسان کرنے والے

کو پسند کرتا ہے)

"وما تنفقوا من خير فلانفسكم!" (البقرہ ع ۳۷) یعنی "وہ خیرات جو تم دو گے اس میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے!"

خذ من اموالهم صدقة تطهرهم وتزكيهم بها" (توبہ ع ۳) یعنی لوگوں کے مال میں سے خیرات وصول کیجیے، اس سے آپ انہیں پاک اور پاکیزہ صفت بنا دیں گے"

قرآنِ حکیم میں جابجا زکوٰۃ کی تحسین فرمائی گئی ہے لیکن اس کے فوائد و برکات کا کہیں بھی وہ ذکر نہیں ہے جو عہدِ حاضر کے دانشمند بیان کرتے ہیں اور عجیب تر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی صفات کا ذکر نہیں فرماتے۔ سورۂ بقرہ کے سترہویں رکوع میں مالِ مکسوبہ کی زکوٰۃ اور پیداوار کے عشر کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہے کہ: "الشيطان يعدكم الفقر ويأمركم بالفحشاء والله يعدكم مغفرة منه وفضلا" یعنی شیطان بہترین اشیاء کی خیرات کرنے والے کو بہکاتا ہے کہ تم محتاج ہو کر رہ جاؤ گے حالانکہ اللہ کا وعدہ یہ ہے کہ اس سے تمہارے گناہوں کی مغفرت ہو گی اور اللہ کا فضل شاملِ حال ہو گا" یعنی اس آیت میں بھی عوام کی بہبود سے قطع نظر خود خیرات کرنے والے کو مغفرت و فضل کی بشارت دی گئی ہے۔

الغرض قرآنِ حکیم میں اس مفہوم کی متعدد آیات ہیں جن میں زکوٰۃ دینے والے کی [illegible] ذاتی بہبود کا ذکر ہے اور ان برکات و فوائد کا ذکر کہیں بھی نہیں ہے جو عہدِ حاضر کے دانشمند بیان کرتے ہیں۔

محترم حضرات! اس سلسلہ میں سورۂ بقرہ کی ابتدائی دو تین آیات پر بھی غور کرنا مناسب ہے،

الٓمّٓ ذلك الكتب لا ريب فيه هدى للمتقين الذين يؤمنون بالغيب ويقيمون الصلوة ومما رزقنهم ينفقون ٥" (یعنی یہ وہ کتاب ہے جس کی صداقت میں مطلقاً شائبۂ شک نہیں کہ یہ ان احتیاط سے قدم اٹھانے والوں کے لیے راہِ عمل دکھاتی ہے جنہیں امورِ غیبی پر ایمان ہے، جو خوش اسلوبی سے نماز پڑھتے اور ہمارے عطا کردہ رزق میں سے کچھ راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں"

یہاں نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے والوں کو متقی کے خطاب سے یاد فرمایا ہے۔

ممکن ہے کہ ایک منطقی ذہن میری گزارشات پر مطمئن نہ ہو یہ سوال ہو سکتا ہے کہ بہر حال زکوٰۃ کے جو فوائد دانشمند حضرات بتاتے ہیں وہ بجائے خود شریعتِ اسلامیہ حکمِ زکوٰۃ کے موجد ہیں، منافی

تو نہیں ہے ہرچند کہ میں اس سوال کا جواب نہ دے سکوں لیکن میرا ذہن اس اضطراب سے محفوظ نہیں رہ سکا کہ یہ تمام فوائد نظامِ زکوٰۃ کے علاوہ کسی اور اقتصادی نظام سے بھی حل ہو سکتے ہیں چنانچہ ایک طبقہ کا خیال یہ ہے کہ یہ فوائد بعض لادینی نظام میں بھی مشاہدہ کیے جاتے ہیں بلکہ اہلِ عقل کا ایک طبقہ شریعت کی متعلین موجودہ زکوٰۃ کو اشتراکی نظام سے ہم آہنگ کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے یہاں تک کہ ایک صاحب نے قرآنِ حکیم کی آیت "ویسئلونك ماذا ینفقون قل العفو" اس آیت میں "عفو" کا یہ مطلب بیان کیا کہ عفو کو راہ خدا میں خرچ کرنے کا حکم ہے اور عفو کے معنے یہ ہیں کہ جو کچھ بنیادی ضروریات جس سے مراد بالعموم روٹی۔ کپڑا اور مکان ہے، سے بچ رہے وہ سب راہِ خدا میں دے دیا جائے۔ اور اس کی تائید میں یہ فلسفہ بیان کیا جاتا ہے کہ بندہ کسی مال کا مالک نہیں ہے! سوشلزم یا اشتراکیت کے نظامِ اقتصادی کی بنا یہی ہے۔ اگر زکوٰۃ کے حامیوں کا یہ رجحان نہ ہو تو پھر اضطراب کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

زکوٰۃ کے اخلاقی اور معاشی فائدوں کے علاوہ ایک اور فائدہ بھی ہے جس کی طرف بہت کم توجہ دی گئی ہے اور وہ معاشرتی فائدہ ہے۔ یعنی صاحبِ مال پر زکوٰۃ کا عائد کرنا ایک قسم کا جرمانہ ہے جو اس جرم کی پاداش میں کیا جاتا ہے کہ صاحبِ مال سال بھر تک اپنی دولت کو بند رکھ کر ان فوائد سے معاشرہ کو محروم رکھتا ہے جو اس مال کو کاروبار میں لگانے سے عوام کو حاصل ہوتا۔ اس عاجز کے نزدیک تمام ملک اور ملت کی یہ سب سے بڑی خدمت ہے کہ اس کی ہمہ جہتی ضروریات مہیا ہوتی رہیں۔ ارتکازِ دولت ملک وملت کو ان فوائد سے محروم کر دیتا ہے جو صنعت وحرفت اور تجارت سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور اس کا انسداد اس صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ "سرمایہ بیکار نیا وردن" کی پاداش میں کوئی جرمانہ عاید کیا جائے۔ مالِ فئے کی تقسیم کے بارے میں قرآنِ حکیم نے جو حکمت بیان فرمائی ہے "کیلا یکون دولة بین الاغنیاء منکم" (حشر: ۷) یعنی مبادا کہ دولت تمہارے امیروں ہی کے ہاتھوں میں گھومتی رہے، اور اس کا عوام کو کوئی فائدہ نہ ہو وہ یہاں بھی عائد ہوتی ہے پس اگر صاحبِ مال دولت کو کام میں نہیں لاتا تو جرم کرتا ہے۔ اور زکوٰۃ اس کی سزا ہے حاصل کلام یہ ہے کہ اسلام میں زکات کو ایک فریضۂ الٰہی قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کا تارک مستوجب عذاب ہے۔ قطع نظر اس سے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی بے شمار فوائد پر منتج ہو۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ وہ فلاح وبہبود ہے جو انجام کار خود زکوٰۃ ادا کرنے والے کو حاصل ہو گا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ فریضۂ زکوٰۃ کی بجا آوری میں صرف خدا اور رسولؐ کے حکم کی اطاعت پیش نظر ہو اور اسے محض عبادت تصور کیا جائے یعنی عبادتِ زکوٰۃ کی شرائط وارکان کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ اور ضابطۂ زکوٰۃ کی اصطلاحات کو

انہی حکموں میں تصور کیا جائے جو شریعت اسلامیہ کے پیش نظر ہے۔ مثلاً صاحب مال نصاب زکوٰۃ نقدی و مال تجارت پیداواری اراضی، اجناس عشری اور مصارف و مستحقین زکوٰۃ کی تعیین و تعریف اور زکوٰۃ کی شرائط و ارکان وغیرہ فقط التشکر والسلام

(منظور احسن عباسی)

اسلامی ٹیکسوں کی تحریم و تعمیل کی ضرورت و افادیت

دیرینہ خواہش کی تکمیل

مقام مسرت ہے کہ اسلامی قوانین کے نفاذ سے قیام پاکستان کی اصل غرض و غایت کی تکمیل کے انقلابی سفر کا آغاز ہو چکا ہے۔ یوں دکھائی پڑتا ہے جیسے اسلام اور وطن سے کھوکھلی عقیدت اور جذباتی نعرہ بازی کا غلغلہ ختم ہو گیا ہے اور قرآن و سنت سے تعمیری لگن اور تخلیقی عمل کا دور شروع ہوا چاہتا ہے۔

معیشت و معاشرت کے اونٹ کا سیدھا روپ:

ہماری معیشت و معاشرت میں مغربیت، سطحیت اور مغایرت کے مسلسل غلبہ سے ہی زندگی اونٹ کی سی شکل اختیار کر گئی تھی جس کی کوئی کل سیدھی نہ رہی تھی۔ نتیجتاً ہم سیاسی عدم استحکام، اقتصادی بدحالی، متنوع ضیاع اور مکرر التواء کے بھنور ہی میں چکر کاٹتے رہے۔ اسلامی آئینِ زندگی کے نفاذ کے بعد ہماری معیشت و معاشرت کو نیا روپ ملنے کے امکانات روشن نظر آنے لگے ہیں اور یوں ملت کا بھٹکا ہوا کارواں اصلاح و ارتقاء کی طرف از سرِ نو جادہ پیما دکھائی دیتا ہے۔

ملت اسلامیہ کے قومی اور آفاقی مقاصد:

کس قدر باعث تاسف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو اسلامی ممالک کو متنوع وسائلی نعمتوں سے خوب نوازا ہے۔ مگر دنیائے اسلام اس کے باوجود پسماندگی کی دلدلوں میں دھنسی ہوئی ہے۔ اس امر کی وضاحت قطعی ضروری نہیں کہ پسماندگی اور اسلام دو متضاد و متحارب تصورات ہیں۔

ایک اشرف الامم کی زبوں حالی فہم و منطق سے ماورٰی ہے۔

ملت اسلامیہ کے سامنے دو بڑے مقاصد یہ ہیں:

۱۔ قومی مقصد: ملکی استحکام و ترقی، جس کے لیے قوت افراد کی اصلاح و ارتقاء اور دستیاب وسائل کے بہترین استعمال کے لیے جامع منصوبہ بندی سے کام لیا جاتا ہے۔

۲۔ آفاقی مقصد: جس کا مطلب ہے ساری کائنات میں زندگی کے تمام شعبوں میں غلبہ اسلام، یعنی صحت و توازن، کی راہ ہموار کرنا۔

اسلامی معیشت کا ایک بنیادی پہلو

ان ہر دو اغراض کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ہر دو کے حصول کے لیے تمام اسلامی ممالک کی قومی معیشت میں استحکام، تخلیقیت اور ارتقاء کی واضح چھاپ ناگزیر ہے۔

اسلامی معیشت ایک متوازن و مفرح طرزِ حیات ہے۔ یہ ایک ایسا منظم لائحہ عمل ہے جس میں حقوق و فرائض کا حسین امتزاج کارفرما ہے۔ معقول ٹیکسوں کا نظام بھی اسلامی معیشت کا ایک تعمیری پہلو ہے۔ اسلامی ٹیکسوں کے نظام میں زکوٰۃ اور عشر بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی ادائیگی ہر صاحبِ استطاعت مسلمان پر فرض ہے۔ قرآن حکیم میں ان ٹیکسوں کے تعمیری مصرف کے باضابطہ طریقے وضع کر دیئے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے ان میں خرد برد، غلط استعمال یا ضیاع کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔

اسلامی ٹیکسوں کی ضرورت اور افادیت:

ایک ٹیکس کی ادائیگی ہزار مصائب سے نجات کی ضمانت فراہم کرتی ہے۔ اگر ہم سب اسلامی ٹیکس باقاعدگی سے ادا کریں اور پھر جمع شدہ رقوم کو جائز سمتوں میں فہم و فراست سے خرچ کریں تو تمام اقتصادی ناہمواریوں کا علاج بالعموم اور مندرجہ ذیل قباحتوں کا استیصال بالخصوص یقینی ہے:۔

(ا) مال و دولت کا غیر منصفانہ ارتکاز اور اس سے جنم لینے والی خرابیاں،

(ب) غربت و افلاس اور متنوع اقتصادی محرومیاں،

(ج) بخل، حرص، سرد مہری، خود غرضی، وغیرہ

(د) تنگ دستی سے فروغ پانے والے جرائم، قبیح عادات اور علتیں،

(ر) ہماری روزمرہ معیشت میں عموماً اور ٹیکسوں کے مروجہ نظام میں خصوصاً بڑھتی ہوئی

گڑبڑ اور عدم نظم و نسق،

(ط) عمومی زندگی میں پژمردگی، بے مقصدیت، جمود اور یبوست کا غلغلہ۔ غرض ٹیکسوں کی باضابطہ ادائیگی اور ان کے مصرف میں حکمتِ عملی سے ہماری ملی زندگی میں مسرت، خوشحالی، توازن اور مقصدیت کے عناصر کے فروغ کی قوی توقع ہے۔ جس سے اسلامی معیشت کے قومی تقاضے بطریق احسن پورے ہونے لگیں گے۔

یہاں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ پاکستان کے جن جن علاقوں میں زکوٰۃ اور بیت المال کا طریق کار چھوٹے پیمانے پر آزمایا جاتا رہا ہے (مثلاً ڈنڈوت کا تجربہ)، وہاں اس کے واضح، مثبت اور انقلابی نتائج ہم سب کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ یہ تمام تجربات اس امر کی موثق ضمانت فراہم کرتے ہیں کہ اگر اس معقول اقتصادی نظام کو باضابطہ طریقِ کار کے طور پر اپنا لیا جائے تو قومی معیشت اور روزمرہ معاشرت میں تعمیری انقلاب حتمی ہے۔

خلاف ورزی کے چند بھیانک عواقب:

کڑے سرکاری احتساب، رائے عامہ کے سیل اور ذاتی ضمیر کی وجہ سے ٹیکس کی خلاف ورزی کا شائد امکان ہی باقی نہ رہے۔ تاہم غلط فہمی، کم فہمی یا عیارانہ انحراف سے خلاف ورزی کسی حد تک ممکن بھی ہو سکتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس بات کی وسیع تر تبلیغ و اشاعت کی جائے کہ اسلامی ٹیکسوں سے انحراف سے ایسی صورتِ حال کے پیدا ہونے کا خدشہ ہے جو ہر فرد اور سارے معاشرے کے لیے باعثِ زحمت ہو سکتی ہے۔

یہ کہ خلاف ورزی کے مرتکب کو آخرت میں سزا بھگتنا پڑے گی بڑی دور کی بات ہے۔ کئی لوگ اسے شائد اچھی طرح سمجھ بھی نہ سکیں۔ مگر یہ بات تو بہت جلد اور بآسانی سمجھ میں آ سکتی ہے کہ ٹیکسوں کی خلاف ورزی سے افراد اور معاشرے کی زندگی میں ہی مندرجہ ذیل تلخ نتائج فوراً مرتب ہو جائیں گے:

(ا) انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جمود و تنزل کا تسلسل،

(ب) حریت و حیات کا انقطاع، ہمیں اسلامی آئینِ حیات اپنانے کا چونکہ یہ پہلا اور آخری موقع نصیب ہوا ہے اس لیے اگر اب بھی اسلامی ٹیکسوں کی خلاف ورزی ہوئی تو آزادی اور زندگی کا سلسلہ ہی منقطع ہو سکتا ہے اس بھیانک ضرورت کے امکانات مندرجہ ذیل اسباب کی وجہ سے خصوصی طور پر باعثِ تشویش ہیں:

اوّل : ہمارے دشمن ہمسایہ نے ایٹم بم بنا لیا ہے اور ہندی معیشت بڑی سرعت سے ترقی کر رہی ہے ۔

دوم : اردگرد کی مخالف طاقتیں ہمارے احیاء سے خائف ہو کر ہمیں نیست و نابود کرنے کے رنگارنگ منصوبوں میں منہمک ہیں ۔

سوم : دنیائے اسلام کو ہم سے بجا طور پر کئی ایک توقعات وابستہ ہیں ، جن پر پورا اترنے کے لیے اسلامی آئین حیات کی دل و جان سے تعظیم و تعمیل ناگزیر ہے ۔

ظاہر ہے کہ ایسے میں اسلامی ٹیکسوں سے انحراف ہمارے لیے باعث زیاں ہو گا ۔ اپنی نیم مردہ معیشت کو یوں مزید ضعف پہنچانا انفرادی خودکشی اور اجتماعی قبر کھودنے کے مترادف ہو گا ۔

بقا اور احیاء کے لیے ناگزیر :

الغرض اسلامی ٹیکسوں کا نفاذ ہماری انفرادی اور ملی زندگی کے احیاء اور ارتقاء کے لیے ایک خوش آئند اقدام ہے ۔ ہماری ذاتی اور اجتماعی خوشحالی ان ٹیکسوں کی تکریم و تعمیل پر موقوف ہے ۔ اس لیے انفرادی مسرت اور ملی خوشحالی کا تقاضا ہے کہ ہم اس سلسلہ میں تعمیلی مشینری سے عملی تعاون کریں کیونکہ بصورتِ دیگر ہماری ذلت و رسوائی میں دوام یقینی ہے ۔

(ڈاکٹر عبدالرؤف)

- خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں ۔
- مضامین کاغذ کے ایک طرف خوشخط لکھیں ۔
- "محدث" خود پڑھیں ، دوسروں کو پڑھائیں اور اس طرح اس کی توسیع اشاعت میں قابل قدر حصہ لیں ۔ یہ آپ کا دینی فریضہ ہے ۔

(والسلام)

اکرام اللہ ساجد
ناظم دفتر



مولانا عبد السلام کیلانی۔ فاضل مدینہ یونیورسٹی

قربانی

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المصطفیٰ، اما بعد،

زیر نظر مضمون میں راقم الحروف نے قربانی کے بارے میں بحثوں کو حتی الوسع بالاستیعاب ذکر کرنے کی کوشش کی ہے، ماسوائے چند فروعی مسائل کے ——— عجز بشری اور قلت مایگی کے اعتراف کے باوجود ارادہ یہی ہے کہ قربانی سے متعلقہ تمام مسائل پر اجمالاً روشنی ڈال دی جائے، کیونکہ "مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ" کے تحت کچھ کرنا ہی نہ کرنے سے بہتر ہے۔

وافوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد

(اخوکم عبد السلام کیلانی)

قربانی کا فلسفہ قربانی کے بارے میں جس قدر فلسفے بھی بیان کیے جائیں ان میں سے سب سے زیادہ قیمتی اور جاندار فلسفہ ذیل کی حدیث رسول میں مذکور ہے۔

عَنْ زَیْدِ بْنِ اَرْقَمَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ قَالَ قَالَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! مَا ھٰذِہِ الْاَضَاحِیُّ؟ قَالَ "سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ" قَالُوْا فَمَا لَنَا فِیْھَا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ قَالَ بِکُلِّ شَعْرَۃٍ حَسَنَۃٌ قَالُوْا "فَالصُّوْفُ[1] یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ" قَالَ بِکُلِّ شَعْرَۃٍ مِنَ الصُّوْفِ حَسَنَۃٌ۔ (رَوَاہُ اَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَۃ)

---

[1] اللہ تعالیٰ کے ارشاد عالیہ "ومن اصوافها واوبارها واشعارها اثاثا ومتاعا الی حین" (النحل) ترجمہ: اور بالوں بھیڑوں کے اور بالوں اونٹوں کے اور بالوں بکریوں کے سے اسباب اور فائدہ ہے ایک مدت تک" صوف

"حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی "یا رسول اللہ! یہ قربانیاں کیا چیز ہیں"؟ ارشاد فرمایا "یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سنت ہے"۔ انہوں نے استفسار کیا "ہمیں کیا ملے گا اے اللہ کے رسول"؟ جواباً ارشاد فرمایا "ہر بال (بکریوں کے) کے بدلے ایک نیکی"! گذارش کی گئی "تو اونی جانوروں (دنبے اور مینڈھے وغیرہ) کے بارے میں کیا حکم ہے"؟ ارشاد ہوا۔ "ان کی اون کے ہر بال (ریشے) کے بدلے میں ایک نیکی ہے"!

اس حدیث شریف میں فلسفۂ قربانی کو آپؐ نے جن الفاظ میں اجاگر فرمایا ہے۔ ان پر فرداً فرداً بحث کی جاتی ہے۔

"سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ"

"کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے"!

یہاں چند چیزیں غور طلب ہیں۔

پہلی سنت[1] یعنی ایسا طریقہ جو کہ قابل اتباع ہو۔

عربی زبان میں دنبوں اور بھیڑوں کی پشم کو کہتے ہیں۔ "وبر" لغت عربی میں اونٹوں کے بالوں کے لئے مخصوص ہے اور "اشعار" "شعر" کی جمع ہے جو بکریوں کے بالوں کے لئے مستعمل ہے۔ "وبر" کی جمع "اوبار" اور صوف کی جمع "اصواف" ہے قرآن مجید نے عربی زبان کی وسعت کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے ہر ایک کے لیے ایک ایک لفظ استعمال کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب "شعرہ" کا لفظ استعمال فرمایا تو صحابہ کرام نے سمجھا کہ اصناف لغت کے لحاظ سے آپؐ کا یہ فرمان بکریوں کے لیے مخصوص ہے اس لیے انہوں نے صوف کے بارے میں مستقل استفسار کیا لیکن جب آپ نے اس موقعہ پر بھی "شعرۃ" کا لفظ استعمال فرمایا تو معلوم ہو گیا کہ "اوبار" (یعنی اونٹوں کے بالوں) کے بارے میں بھی یہی آپؐ کی مراد ہے اور "شعرۃ" لفظ عام خواہ بکریوں کا ہو۔ دنبوں اور بھیڑوں کا ہو خواہ اونٹوں کا ہو۔ اسی وجہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے "اوبار" کے متعلق سوال نہیں کیا۔ علی ہذا القیاس گایوں کے بارے میں بھی سوال کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ جامع جواب ایک ہی تھا جو ہر ایک کو شامل تھا۔ واللہ اعلم۔

[1] عربی زبان میں اس کا مادہ "س، ن، ن" ہے محاورے میں بناء مجہول سے اس کا استعمال یوں ہے۔ "سُنَّ الشَّیْئُ" کسی مخصوص چیز کو قالب میں ڈھال دیا گیا۔ جب جو چیز ڈھالی گئی، وہ مسنون کہلاتی ہے۔ نیز "سُنَّ الشَّیْئُ" سے مراد اس میں بدبو آنا بھی مراد لیا جاتا ہے۔ "سَنَّ الْوَجْہَ یَسُنُّہٗ سَنًّا" صَوَّرَہٗ وَصَقَلَہٗ "چہرے کی شکل بنائی اور اسے چمکایا"۔ تو وہ چہرہ مسنون ہے۔ یہ تمام معانی قرآن مجید کے اس فرمان سے مراد لئے گئے ہیں۔ "وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ" (الحجر: ۲۶، ۲۸، ۳۳) (باقی اگلے صفحہ پر)

دوسری غور طلب چیز۔ لفظ "اَبِیْکُمْ" ہے۔

اطلاقِ اول میں "اَبْ" سے مراد وہ باپ ہے جو سب سے قریبی ہو۔ لیکن کبھی کبھی سیاق و سباق کے لحاظ سے اس سے مراد دادا وغیرہ بھی لیا جاتا ہے قرآن مجید نے ان دونوں اطلاقات کو روا رکھا ہے چنانچہ اطلاق اول میں ملاحظہ ہو:

"مَا كَانَ مُحَمَّدٌ أَبَا أَحَدٍ مِنْ رِجَالِكُمْ" نہیں ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم لوگوں میں سے کسی ایک مرد کے باپ"۔

یعنی زید بن محمد" کہنے والوں کو منع کیا جا رہا ہے کہ تم زید اور اس کے علاوہ بھی کسی بالغ مرد کو "بن محمد" نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ یہاں "اُبُوّت حقیقی" مراد ہے۔ یعنی کسی کے بھی حقیقی باپ نہیں ہیں۔

اطلاقِ دوم میں ملاحظہ ہو:

"يَا بَنِي آدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطَانُ كَمَا أَخْرَجَ أَبَوَيْكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا ...... الآیۃ"

"اے اولادِ آدم ہرگز تمہیں شیطان فتنے میں نہ ڈالے جیسا کہ اس نے تمہارے ماں باپ کو جنت سے نکال دیا تھا کہ ان کے لباس اتارنے شروع کر دیئے تھے"

یہاں سیاق و سباق نے واضح کر دیا کہ ماں باپ سے مراد آدم اور حوّا ہیں جو کہ سب سے پہلے ماں اور باپ ہیں یعنی بنی نوع انسان کے والدین ہیں۔

لفظ "ابراھیم"

اَبِیْکُمْ سے بدل ہے گویا اس باپ سے مراد[1] ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ نہ قریبی باپ اور نہ ہی آدم علیہ السلام، بلکہ ابراہیم علیہ السلام مقصود ہیں۔

(حاشیہ بقیہ صفحہ) گویا انسانی خمیر بدبودار کیچڑ سے تیار ہوا ہے یا قالب والے کیچڑ سے انسان کو پیدا کیا ہے یا کیچڑ سے چہرے کی شکل بنا کر حمکا کر انسانی خلقت تیار ہوئی ہے۔ اَلسِّنُّ۔ دانت، کما فی قولہ تعالیٰ "والسن بالسن" (المائدہ، آیت ۴۵)

اَلسُّنَّۃ: الطریقہ و الخطہ المتبعۃ: "طریقہ اور ایسا نشان راہ جس کی پیروی کی جا رہی ہو۔

ج: السنن، فرمانِ الٰہی ہے "سُنَّةَ مَنْ قَدْ أَرْسَلْنَا مِنْ رُسُلِنَا" "خدائی نظام" بھی مراد لیا جاتا ہے جیسے اس آیت کا بقیہ ملاحظہ ہو " وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيلًا" "ہمارے نظام میں آپ کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے" (الاسراء: ۷۷)

[1] اسی طرح ایک دفعہ قصہ اسمٰعیل و ابراہیم علیہما السلام (باقی آگے)

سنة ابيكم ابراهيمؑ

کے بارے میں ہمیں دیکھنا ہے کہ وہ کون سی سنت ہے۔ سنتِ ابراہیمی سے مراد یہاں ذبح کرنے کا واقعہ ہے جو کہ پہلے اپنے بیٹے سے متعلق تھا۔ لیکن جب وقتِ ذبح آیا تو بیٹے کی جگہ دنبہ ذبح ہو گیا اور بیٹے کو بچا لیا گیا۔

قرآن مجید میں سورہ "صٰفّٰت" میں اس واقعہ کا منظر خود کلامِ الٰہی سے ملاحظہ فرمائیں تو مزید کسی وضاحت کی ضرورت نہیں رہتی۔ ذیل میں پہلے ان آیات کا ذکر کرتے ہیں پھر ان کا ترجمہ لکھیں گے:

"وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِيْنِ ۝ رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝
فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ إِنِّيْ أَرٰى
فِي الْمَنَامِ أَنِّيْ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى ۝ قَالَ يٰأَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ
سَتَجِدُنِيْ إِنْ شَاءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ فَلَمَّا أَسْلَمَا وَتَلَّهُ
لِلْجَبِيْنِ ۝ وَنَادَيْنٰهُ أَنْ يّٰإِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّؤْيَا
إِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝
وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝ سَلٰمٌ
عَلٰى إِبْرٰهِيْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا
الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَبَشَّرْنٰهُ بِإِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝

"حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں جانے والا ہوں اپنے رب کی طرف (بغرض ہجرت) وہ مجھے عنقریب راہ دکھلائے گا۔ اے میرے پروردگار مجھے نیک اولاد دے۔ تو ہم نے اسے حوصلہ مند لڑکا دیا۔ پس جب یہ لڑکا دوڑنے کے قابل ہوا۔ کہا اے میرے بیٹے! میں خواب میں تجھے ذبح کرتا ہوا دیکھتا ہوں۔ بتا تیری رائے کیا ہے؟ کہا بیٹے نے اے میرے باپ کر جو تجھے حکم ملا۔ ان شاء اللہ تو مجھے صبر

میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جب حضرت ہاجرہؑ کا صفا و مروہ کے درمیان چکر ختم کرنے اور زمزم مل جانے کا ذکر فرمایا۔ وہاں آخر میں کہہ دیا۔ "فتلك امكم يا بني ماء السماء" "اے آسمانی پانی کے بیٹو! یہ تمہاری ماں ہاجرہ ہیں" عرب کھیتی باڑی اور پینے پلانے کے لیے رحمتِ باراں کے ہر وقت محتاج رہتے تھے۔ اس لیے انہیں "آسمانی پانی کے بیٹو" کہہ کر ان کی ماں ہاجرہ کا ذکر کیا ہے۔



کرنے والوں میں پائے گا۔ پھر جب باپ بیٹا دونوں فرمانبردار ہوگئے اور (باپ نے) اسے (بیٹے کو) پیشانی کے بل لٹا دیا۔ تو ہم نے آواز دی اے ابراہیم! بتحقیق تو نے خواب سچا کر دکھایا۔ ہم اسی طرح احسان کرنے والوں کو جزا دیتے ہیں۔ یہ تو بہت بڑی آزمائش ہے۔ اور ہم نے ایک بہت بڑے ذبیحہ کا فدیہ دے کر اسے[1] (ذبح ہونے سے) بچا لیا۔ اور چھوڑا ہم نے اوپر اس کے (یعنی ذکر خیر کے) پچھلوں میں۔ سلام ہو ابراہیمؑ پر۔ اسی طرح ہم جزا دیتے ہیں احسان کرنے والوں کو، وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔ اور ہم نے بشارت دی اسحٰقؑ کی کہ وہ صالح پیغمبر ہوگا۔"

---

[1] سیاق و سباق سے ظاہر ہے کہ ذبح ہونے والے اسمٰعیلؑ تھے۔ کیونکہ اگر اسحاق علیہ السلام کو مانا جائے تو ذکر اسحاقؑ میں تکرار لازم آئیگا۔ حالانکہ عطف میں اصل مغایرت ہے تکرار نہیں ہوتا۔

دوسرے "غلام حلیم" ایسا وصف ہے جس کی توضیح خود اللہ تعالیٰ نے حضرت اسمٰعیلؑ کے اس جملے سے کر دی "یا ابت افعل ما تؤمر ستجدنی ان شاء اللہ من الصابرین"۔ "اے باپ جو آپ کو حکم ملا ہے وہ کیجئے۔ ان شاء اللہ عنقریب آپ مجھے صبر کرنے والا پائیں گے"۔ اور حضرت اسحاقؑ کے بارے میں جو وصف مذکور ہے وہ "بشرناہ بغلام علیم" ہے کہ "ہم نے علم والے لڑکے کی خوشخبری دی" (سورہ ذاریات)

تیسرے حضرت اسحاقؑ کی خوشخبری جس روز ملی۔ اسی روز ان کے بیٹے حضرت یعقوبؑ کی بھی خوشخبری مل گئی تھی۔ چنانچہ سورۂ ہود میں ہے۔

"وامراتہ قائمۃ فضحکت فبشرنٰہا باسحٰق ومن وراء اسحٰق یعقوب"

اور ان کی بیبی سارہؑ کھڑی تھی وہ ہنس دی تو ہم نے اس کو خوشخبری دی اسحاقؑ (اس کا بیٹا پیدا ہونے) کی اور اسحاقؑ کے بعد (اسحاقؑ کا بیٹا) یعقوبؑ پیدا ہونے کی؟

تو کیا یہ ممکن ہے کہ آج حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کے ساتھ ہی ان کے بچے یعقوبؑ کے تولد کی خبر ہو اور کل کو بچپن میں ہی اسحاقؑ کو نوجوان ہونے سے پہلے ہی چھری کے نیچے رکھنے کا حکم مل جائے۔ تو تین باتوں میں سے ایک بات ہونا ضروری ہے۔

۱۔ یا تو دعویٰ کریں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بچپن کی یہ بشارت بھول گئی تھی جو بظاہر ممکن نہیں کیونکہ پیغمبر اتنی دیر تک نہیں بھولتے جب تک کہ اس میں خاص حکمت نہ ہو اور ان کی بھول کو واضح کیا جاتا ہے تاکہ آنیوالی امتوں کیلئے بطور سبق پیش کیا جائے۔

۲۔ پہلی بشارت کو غلط قرار دیا جائے۔ والعیاذ باللہ۔ یہ پہلے سے بھی ناممکن ہے۔

۳۔ یا امتحان کو ہی وہ شر درشے ایک مذاق سمجھتے ہوں یہ بھی ناممکن ہے کیونکہ انہوں نے اور ان کے لخت جگر نے (باقی آگے)

قَالُوْا فَمَالَنَا فِيْهِمَا يَا رَسُوْلَ اللهِ

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو عبادات میں بھی اپنے صلہ کا انتظار رکھنا چاہیئے اگر صلہ معلوم نہ ہو سکے تو پوچھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے اطمینان قلب اور شوق عبادات میں بتدریج اضافہ ہوتا جائے گا۔

شبہ ۔ بعض صوفیاء نے یہ بحث چھیڑی ہے کہ جنت کی طلب ایک کمزور طلب ہے ہمیں خدا کی رضا کا طلب گار ہونا چاہیے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ!

"طالب الدنیا مونث، طالب الجنۃ مخنث، طالب اللہ مذکر"۔ گویا ان کے نزدیک جنت کا سوال کرنا ہی خلافِ آدابِ صوفیاء ہے۔ اور غایہ طلب خداوندی کو بتایا گیا ہے اور طلبِ خداوندی سے مراد اس کی رضا ہے۔ تو گویا رضاءِ الٰہی مانگنا ان کے نزدیک ہی مردانگی ہے دنیا کی طلب تو خیر کسی کے نزدیک بھی قابل ستائش نہیں ہو سکتی جب تک کہ طلبِ جنت اس کے ساتھ مربوط نہ ہو۔

جو ذبح ہو رہے تھے، دونوں نے خواب کے اس فعل کو امرِ الٰہی تصور کیا اور جب امرِ الٰہی کا تصور ہو جائے تو کبھی مذاق نہیں سمجھا جاتا۔ جب یہ تینوں نا ممکن ہیں تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ ذبح ہونے والے اسمٰعیل علیہ السلام ہی تھے نہ کہ اسحاق علیہ السلام۔ جب کہ پہلی دو دلیلیں بھی اسی کے حق میں جا رہی ہیں۔

چوتھے اس بارہ میں توراۃ کتاب پیدائش عربی ایڈیشن کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

"اذبح ابنك الوحيد"

"اپنا اکیلا بیٹا ذبح کر دو" یعنی اکلوتا بیٹا۔ اور اکلوتا اتنی دیر تک نہیں سمجھا جاتا جب تک کہ یہ یقین نہ ہو جائے کہ کوئی اور بیٹا پاس نہیں تھا۔

جب اسحاق علیہ السلام مراد لیے جائیں تو حضرت اسماعیل السلام جو ان سے چودہ برس بڑے ہیں تو وہ نفی کرتے ہیں کہ حضرت اسحاق علیہ السلام بوقتِ امرِ ذبح اکلوتے بیٹے نہیں تھے۔ ہاں اگر اسمٰعیل علیہ السلام مراد لیے جائیں تو چودہ برس سے قبل کسی بھی عمر کے موقع پر حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنے کا امر ملے گا تو یہی کہا جائے گا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر دو۔ کیونکہ اس وقت ان کے علاوہ کوئی اور اکلوتا بیٹا نہیں تھا۔

پانچویں دلیل یہ ہے کہ یہ واقعہ ذبح مکہ مکرمہ کے آس پاس پیش آیا تھا اور فدیہ میں جو دنبہ ذبح ہوا تھا اس کے سینگ اسلام سے قبل مدت تک خانہ کعبہ کے ساتھ آویزاں رہے تھے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کا مکہ مکرمہ میں خصوصاً چھوٹی عمر میں آنا ثابت نہیں ہے۔ واللہ اعلم



اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں:

"فمن الناس من یقول ربنا آتنا فی الدنیا وما لہ فی الاٰخرۃ من خلاق ومنھم من یقول ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاٰخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار۔ اولٰئک لھم نصیب مما کسبوا"

کہ جو یہ کہے کہ خدایا مجھے دنیا دے تو اس کو آخرت میں کچھ نہیں ملے گا۔ اور جو یہ کہے کہ خدایا مجھے دنیا اور آخرت کی بھلائی مل جائے اور آگ کے عذاب سے بچا لے۔ تو ان کا حصہ اپنی کمائی کا ہے۔۔۔ الآیات

لیکن یہ دعویٰ کرنے والے کہ "جنت کا طلب گار مخنث ہے" وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ رضائے الٰہی اور جنت کا حصول لازم ملزوم ہیں۔ اتنی دیر تک جنت نہیں مل سکے گی جب تک خداوند تعالیٰ راضی نہیں ہوگا۔ کیونکہ کسی شخص کا عمل اسے جنت میں لے جانے کے لیے کافی نہیں ہے جب تک کہ خدا کی رحمت شاملِ حال نہ ہو۔ اور خدا کی رحمت اس کی رضا سے ہی حاصل ہو سکے گی اور جب تک خدا راضی نہیں ہوگا اسے نہ خدا ہی مل سکے گا اور نہ ہی جنت مل سکے گی۔ اور اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ رضائے الٰہی مل جائے اور جنت نہ ملے۔ رضاء الٰہی اور جنت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ وہ حدیث اس کی مزید تشریح کرے گی، جس میں ایک آدمی کا ذکر ہے جو سب سے آخر میں دوزخ سے نکلے گا اور سب سے آخر میں جنت میں جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے مختلف وعدے لیں گے لیکن وہ وعدہ دینے کے باوجود اس پر قائم نہیں رہ سکے گا۔ یعنی پہلے وہ دوزخ سے نکلنے کا مطالبہ کرے گا پھر دوزخ سے منہ پھیر دینے کا مطالبہ، پھر دوزخ سے دور کیے جانے کا، پھر جنت کے دروازے تک پہنچ جانے کا، پھر جنت کے اندر داخل ہونے کا۔ اللہ تعالیٰ ہر طلب پر اس سے وعدے لیں گے اگر یہ تمہاری آرزو پوری ہو جائے تو اور تو نہیں مانگے گا۔ وہ قسمیں کھا کر یہ کہے گا کہ ہاں الٰہی میں اور طلب نہیں کروں گا لیکن آخری بار جب جنت میں جانے کا بھی سوال کر دے گا تو اللہ تعالیٰ مسکرا دیں گے اور اسے جنت میں داخل کر دیں گے۔ علاوہ ازیں کئی گنا اپنے فضل سے مزید اسے نوازیں گے۔

گویا ادنیٰ جنتی اور آخری دوزخی بھی (جو دوزخ سے نکل جائے گا) اتنی دیر تک جنت میں نہیں جا سکے گا۔ جب تک خدا راضی نہ ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے:

"اللّٰهم اني أسئلك رضاك والجنة وما قرب اليها من قولٍ اوعملٍ واني اعوذبك من سخطك والنار وما قرب اليها من قولٍ اوعملٍ"

"خدایا میں تجھ سے تیری رضا اور جنت کا مطالبہ کرتا ہوں اور جو چیز جنت کے قریب کرنے والی ہو، خواہ کوئی کلام ہو یا عمل۔ اسی طرح میں تیرے غصے اور دوزخ سے پناہ مانگتا ہوں اور جو چیزیں اس کے نزدیک کر دیتی ہیں قول ہو یا عمل"!

ایک اور حدیث کے مطابق۔

جنت دوزخ دونوں کا مقابلہ ہوا جنت کہتی کہ میں اچھی اور دوزخ کہتی کہ میں اچھی۔ اللہ تعالیٰ نے جنت کو مخاطب فرمایا "کہ تو ان کے لیے ہے جن پر میں راضی ہوتا ہوں۔ اور دوزخ کو کہ تو ان کے لیے بطور سزا ہے جن پر مجھے ناراضگی ہو گی۔

تو مسئلہ قربانی میں بھی ہمیں اسی سبق کی تعلیم دی گئی ہے جو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل علیہ السلام کو بوقت ذبح پڑھایا تھا اور ان کے توسط سے تمام آنے والی نسلوں کو یہ سبق دیا گیا۔ اور یہ سبق کبھی بھی منسوخ نہیں ہوا۔

بِکُلِّ شَعْرَۃٍ حَسَنَۃٌ

ہر بال کے بدلے نیکی

ہو سکتا ہے کہ یہاں نیکی کی کثرت مراد ہو۔ جیسے کہ جانوروں کے بالوں کو گننا محال ہے اس طرح قربانی کا اجر بے شمار ہو گا۔ لیکن ظاہر حدیث بھی مراد ہو سکتی ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں نازل فرمائے گا کہ اگرچہ آپ گن نہ سکیں گے۔ تاہم وہ علّام الغیوب ان تمام بالوں کے مطابق نیکیاں نازل فرما دے گا جو کہ مذبوحہ کے جسم پر موجود ہیں۔ واللہ اعلم

الغرض اس حدیث سے قربانی کا فلسفہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت کو زندہ کرنا مقصود ہے۔

سوال: عام طور پر یہاں اس مقام پر اور ایسی ہی دوسری حدیثوں پر اصول الفقہ میں ایک بحث کی جاتی ہے کہ انبیائے سابقین کی شریعت کیا ہمارے لیے حجت ہے یا نہیں؟ پہلی شریعتوں میں جو احکام نازل ہوئے، اگر ہم بعینہٖ ان کو قبول کر لیں تو کیا ہمارے لیے جائز ہے؟

جواب: اگر ہم مطلق جائز قرار دیں تو بھی درست نہیں۔ کیونکہ اس طرح دو بہنوں کا نکاح

ایک وقت میں ہمیں جائز قرار دینا ہوگا۔ جیسے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھر میں حضرت عیسٰی کی دو بیٹیاں نکاح میں تھیں (ملاحظہ ہو کتاب "پیدائش توراۃ) اسی طرح سجدہ تعظیمی کو بھی جائز قرار دینا ہوگا۔ جیسا کہ حضرت یعقوبؑ، ان کی بیوی اور ان کے گیارہ بیٹوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا۔ قرآن مجید میں ہے۔

"وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا"

"وہ اس کے لیے سجدہ میں گر گئے" اور اگر ہم مطلق ناجائز قرار دیں تو بھی درست نہیں۔ کیونکہ اگر مطلقاً منع ہو تو کئی آیات اور کئی احادیث میں پہلے نبیوں کی شریعت کو بطور حجت پیش کیا گیا ہے۔ خصوصاً مسئلہ توحید کی وضاحت میں ہر نبی کے واقعات کو ہمارے لیے حجت بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ تو صحیح جواب یہ ہے کہ:

"شرع من قبلنا شرع لنا مالم یرد فیہ نسخ"

"پہلے لوگوں کی شرع ہمارے لیے بھی شریعت ہے جب تک کہ اس میں نسخ وارد نہ ہوگا"

سوال:۔ عام طور پر یہاں یہ سوال بھی اٹھایا جاتا ہے کہ قربانی کی کیا ضرورت ہے؟ بلکہ جانور ذبح کرنے کی بجائے قربانی کی رقم کسی غریب، مسکین، یتیم، فقیر، مدرسہ، یا خدمت خلق کے اداروں میں جمع کرا دی جائے۔ کیا ضرور ہے قربانی ہی ہو۔؟

جواب:۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے سے پہلے بنیادی طور پر یہ اصول ہمیں سامنے رکھنا چاہیے کہ:

"وَلَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ"

"رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ میں ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے"

اس ضرورت کا جس قدر احساس رحمۃ للعالمین کو ہو سکتا ہے اتنا کسی کو نہیں ہو سکتا تھا۔ اور جس قدر ضرورت اس دور غربت میں پیش آئی اس قدر ضرورت کبھی بھی مسلمانوں کو پیش نہیں ہوئی خود کئی کئی ماہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں آگ نہیں جلتی تھی۔ تو پھر کیا وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ضرورت کو نظر انداز فرمایا؟ صحابہ کرام کی ضرورت کی طرف توجہ نہیں فرمائی۔ شہدائے بدر، شہدائے احد، شہدائے خندق کے وارثوں، یتیم بچوں، بیواؤں کو نہیں دیا؟ بلکہ ان قربانیوں کو ہمیشہ حضور خداوندی میں پیش کرتے رہے اور مدنی دس برس تک اس پر باقاعدہ عمل ہوتا رہا۔ کسی سال میں تنگی و ترشی مانع نہیں ہوئی کہ قربانی سے گریز کریں (رواہ الترمذی)

دراصل قربانی کرنا سنتِ ابراہیمی ہے۔ جو کہ بیٹے کے ذبح کے لیے تیار ہو جانے کی یادگار ہے۔ اگر خدانخواستہ حضرت اسمٰعیلؑ ذبح ہو جاتے تو تمام دنیا کے مذاہب میں بچوں کو ذبح کرنے کا حکم مل جاتا ۔۔۔ لیکن خداوندِ قدوس نے اپنی رحمتِ خاص سے اپنی مخلوق کو اس آزمائش میں نہیں ڈالا بلکہ حکم دیا کہ فدیہ کسی جانور کا دے دو۔ اور اگر جانور کی بجائے مال نقدی ہو جاتا تو (۱) کب وہ سنت یاد تی؟ (۲) کتنے لوگ وہ رقم صحیح جگہ خرچ کرتے؟ (۳) کتنے غریب لوگ اس رقم سے اپنا پیٹ پال سکتے؟ جب کہ گوشت کے وجود سے ہی ان کے استحقاقات کی سب کو خبر بھی ہو جاتی ہے۔ اور سب اپنے ہاتھوں اپنا حق مانگ کر لیجاتے ہیں اور کبھی سال میں ایسا دن بھی چاہیئے جب کہ غریب آدمی بھی سیر ہو کر گوشت کھائے۔ اگر اسے پیسے مل گئے تو وہ ضرورت کا لحاظ کرتا ہوا کھانے پینے کی بجائے اس رقم کو کسی دوسری مد میں خرچ کر دے گا۔ لیکن گوشت کچا بے کر وہ ایسا نہیں کر سکتا بلکہ خود کھائے گا اور بچوں کو بھی کھلائے گا۔ اور گوشت انسانی زندگی کے لیے ایک نہایت ضروری جزو ہے اور طاقت اور وٹامن کی کثرت جس قدر گوشت میں ہے کسی اور چیز میں کم ہے۔ مزید برآں اس سے دل کی قوت اور جرأت میں اضافہ پیدا ہوتا ہے۔ جو کہ مسلمانوں کے لیے کم از کم نہایت ضروری ہے۔ نیز اگر قربانی کی رقم کا مسئلہ جائز قرار دیا جائے تو ان عیدین کے بارے میں جو ارشادِ نبوی ہے۔ کہ

"أَيَّامُ أَكْلٍ وَشُرْبٍ"

"یہ کھانے پینے کے دن ہیں" اس پر کم از کم عمل ہونے سے رہا۔

فلسفۂ قربانی کا بنیادی مقصد!

سوال:۔ جب یہ معلوم ہو چکا کہ یہ سنتِ ابراہیمی ہے اور اس سنت کو زندہ رکھنا چاہیے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سنت کو زندہ رکھنے سے کیا فائدہ ہے؟

جواب:۔ انبیاءؑ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کرنے سے انسان دنیاوی ہلاکتوں سے بچ جاتا ہے اور اخروی پریشانیوں سے نجات پا جاتا ہے مزید برآں اس سے دین و دنیا کی فلاح و بہبود میسر ہوتی ہے قرآن مجید میں ہے:

"وَمَن يُطِعِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَيَخْشَ اللَّهَ وَيَتَّقْهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ"

"اور جو کوئی فرمانبرداری کرے اللہ کی اور اس کے رسولؐ کی اور خدا سے ڈرے اور پرہیزگاری اختیار کرے تو ایسے ہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں" (النور)



گویا کامیابی کا دارومدار اطاعت اللہ و رسول میں ہے اس سورت کے آخر میں ارشاد ہے :

"فليحذر الذين يخالفون عن امره ان يصيبهم فتنة او يصيبهم عذاب اليم"

"چاہیے کہ ڈر جائیں وہ لوگ جو کہ اس امر کی مخالفت کرتے ہیں کہ وہ فتنے میں مبتلا ہو جائیں یا عذاب الیم ان کا مقدر بن جائے"

گویا اسوۂ رسول کو قائم رکھنا اس میں دین و دنیا کی کامیابی ہے اور اس سے گریز دین و دنیا کے مصائب اور فتنے میں مبتلا ہونے کا باعث ہوگا۔ والعیاذ باللہ

اور جس حکمت میں دین و دنیا کی کامیابی بھی ہو اور دونوں جہانوں کے فتنوں سے حفاظت کی بھی ضمانت ہو وہ کس قدر عظیم اور بابرکت ہوگی تو گویا اس سے دونوں جہانوں کی سرخروئی مقصود ہے۔

اور اگر واقعی مقصود ہو تو معلوم ہونا چاہیے کہ قلبی تقویٰ کے بغیر یہ گوہر مقصود حاصل نہیں ہوگا۔ نہ یہ قربانیاں اور اوپری چھریاں، یہ بھی خدا کو معلوم ہیں اور دل کی گہرائیوں سے محبت الٰہی میں سرشار ہو کر اپنے مال پر چھری چلا دینا یہ وہ تقویٰ ہے جس کا ہابیل نے قابیل کو سبق دیا تھا۔

"واتل عليهم نبأ ابني ادم بالحق اذ قربا قربانا فتقبل من احدهما ولم يتقبل من الاخر قال لاقتلنك قال انما يتقبل الله من المتقين"

"اور پڑھ تو ان پر آدمؑ کے دو بیٹوں کا سچا قصہ، جب دونوں نے قربانی کی، ایک کی قبول ہو گئی اور دوسرے کی قبول نہیں ہوئی تو کہنے لگا کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا تو جواب دیا ہابیل نے قابیل کو کہ اللہ تعالیٰ متقین سے قبول کرتا ہے"۔ یعنی تقویٰ شرط ہے۔

اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہے :

"لن ينال الله لحومها ولا دماؤها ولكن يناله التقوى منكم"

"کبھی خدا کو ان کا گوشت اور ان کے خون نہیں پہنچیں گے لیکن تمہاری طرف سے تقویٰ اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچے گا"۔

تو معلوم ہوا، قربانی کا فلسفہ سنتِ ابراہیمی کو قائم رکھنا ہے۔ اور سنت ابراہیمی کے احیاء کا اصل مقصد جبھی حاصل ہوگا جب تقویٰ پایا جائے گا۔ واللہ اعلم۔ وصلی اللہ وسلم علی عبدہ و رسولہ محمد وعلی آلہ وصحبہ وسلم

(۳) قربانی کا لغوی مفہوم

ا۔ قَرُبَ الشیئی یقربہ قربانا ، دنا منہ او فعلہ ، یعنی باب (فتح ، یفتح) قرآن مجید میں ہے۔

"وکلا منہا رغدا حیث شئتما ولا تقربا ھٰذہ الشجرۃ" (البقرہ ۳۵)

"ای لا تدنوا منہا یعنی اس کے قریب نہ جاؤ"

"یا ایہا الذین امنو لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ"

"اے مومنو بحالتِ سکر نماز کے قریب نہ جاؤ" (النساء آیت ۴۲)

ب۔ قَرَّبَ قُرْبَانًا ، قَدَّمَہٗ تَقَرُّبًا اِلَی اللّٰہِ

قرآن مجید میں ہے:

"واتل علیہم نبا ابنی ادم بالحق اذ قربا قربانا" (المائدہ)

"ای قدماہ تقربا الی اللّٰہ" "خداوند تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے پیش کیا"

ج۔ قَرَّبَہٗ اِلَیْہِ = "ادناہ منہ" "اسے اس کے قریب کیا"

یُقَالُ قَرَّبْتُ فُلَانًا اِلَیَّ = "اَدْنَیْتُہٗ مِنِّیْ" "اسے میں نے اپنے نزدیک کر لیا"

قرآن مجید میں ہے۔

"ونادینٰہ من جانب الطور الایمن وقربنٰہ نجیا" (مریم - ۵۲)

"ہم نے اسے طور کی دائیں جانب سے آواز دی اور اسے قریب کیا سرگوشی کرتے ہوئے"۔

ایک دوسری آیت میں ہے۔

"وما اموالکم ولا اولادکم بالتی تقربکم عندنا زلفیٰ"

"تمہارے مال و دولت اور تمہاری اولادیں وہ ایسی نہیں جو تمہیں ہمارے نزدیک کر دیں"

د۔ اقترب الامر :- "دنا دنوا شدید محققا"

"بہت زیادہ یقینی طور پر قریب ہوا"

ھ۔ ویقال :"اقترب العبد الی ربہ" :"تقرب الیہ وسعی فی رضاہ بالعمل الصالح"

"اس کا قرب حاصل کیا اور اس کی رضا ڈھونڈنے کی عمل صالح کے ساتھ کوشش کی" پہلے مفہوم میں قرآن مجید میں ہے۔

"وان عسیٰ ان یکون قد اقترب اجلہم" (الاعراف)

"قریب ہے کہ ان کا حساب یقینی طور پر نہایت ہی نزدیک آچکا ہے" دوسرے مفہوم میں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"کلا لا تطعه واسجد واقترب"

"ہرگز نہیں اس کی تابعداری نہ کر اور سجدہ کر اور عمل صالح کے ذریعے اس کی رضا ڈھونڈ اور قرب حاصل کر"۔

ق۔ اَلْقُرْبَۃُ :۔ "ما یتقرب بہ الی اللہ من عبادۃ او عمل خیر (جمع قربات"

سورہ توبہ آیت ۹۹ میں ہے۔

"اَلَا اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ" "خبردار رہو یہ ان کا عمل صالح ہے جو انہیں خدا کے قریب لے جاتا ہے"۔ اسی جگہ اسے جمع بھی استعمال کیا گیا ہے۔

"ویتخذ ما ینفق قربات عند اللہ"

"جو وہ خرچ کرتا ہے اسے خدا کے نزدیک قرب حاصل کرنے کے لیے شمار کرتا ہے"

ز۔ باب "کرم یکرم" سے

"قَرُبَ الشیٔ" "قریب ہوئی"۔ فا۔ تقریب فی المکان او الزمان او ذو قرابۃ فی النسب" اس کی فاعلی حالت "قَرِیْبٌ" آئے گی۔ خواہ یہ قرب زمانی ہو یا مکانی ہو نیز نسبی طور پر قرابت دار کو بھی قریب کہیں گے۔ قرآن مجید میں ہے۔

"واذا سألك عبادی عنی فانی قریبٌ" "اور جب میرے بندے میرے متعلق تجھ سے سوال کریں تو میں قریب ہوں (یعنی اس کا جواب یہ ہے کہ میں قریب ہوں)"

قرب زمانی کے لیے ملاحظہ ہو۔

"اَلَا اِنَّ نصر اللہ قریب" (البقرہ)

"خبردار، اللہ تعالیٰ کی امداد قریب ہے"۔ قرب مکانی کے لیے:

"وَاُخذوا من مکان قریب" (سبا ۵۱)"

"یہ مکان قریب سے پکڑے جاویں گے"۔

"واستمع یوم ینادِ المناد من مکان قریب" (ق) "غور سے سن! جس دن منادی قریب ہی سے بلائے گا"۔ اسم مونث کی خبر بھی اسی وزن میں وارد ہے۔

"ان رحمۃ اللہ قریب من المحسنین" "خدا کی رحمت نیکوں کے قریب ہے"

"لعل الساعة قريب" "شاید کہ قیامت قریب ہو"

ح۔ یعنی رشتہ دار (النسبی)، سورۂ شوریٰ میں ہے۔

"قل لا اسألكم عليه اجرا الا المودة فى القربى"

"کہہ دو میں کوئی مزدوری نہیں مانگتا مگر قرابت داروں میں محبت پیدا ہو جانے کا مطالبہ ہے"

ط۔ المقربون، المقرب، "من يحظى بمنزلة رفيعة عند الله" (جمع، المقربون)

"جو خداوند تعالیٰ کے ہاں بلند مرتبہ حاصل کرے" قرآن مجید میں ہے۔

"لن يستنكف المسيح ان يكون عبدا لله ولا الملائكة المقربون" (النساء)

"کبھی مسیح اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ وہ اللہ کا غلام ہو۔ اسی طرح مقرب فرشتے بھی اس بات سے کبھی انکار نہیں کریں گے"

"وجيها فى الدنيا والآخرة ومن المقربين"

"دنیا و آخرت میں عزت والا اور مقرب لوگوں سے"

ی۔ القربان :- "الذبيحة ونحوها يتقرب بها الى الله"

"مذبوح وغیرہ جن سے اللہ کا قرب حاصل کیا جاتا ہے"۔ اس معنیٰ میں قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

"إن الله عهد الينا الا نؤمن لرسول حتى يأتينا بقربان تأكله النار"

"خداوند تعالیٰ نے ہم سے وعدہ کر لیا کہ اتنی دیر تک کسی پیغمبر کو قبول نہ کریں جب تک کہ قربانی ایسی نہ لائے جسے آگ کھاتی ہو" (آل عمران آیت ۱۸۳)

قربانی کا شرعی مفہوم

لغوی مفہوم میں اس کی تفصیل کے بعد اب شرعی مفہوم کی طرف توجہ فرمائیں۔ شرعی مفہوم میں بھی لغوی مفہوم کا اثر موجود ہوتا ہے۔

قربانی میں چونکہ مندرجہ بالا لغوی تمام مفہوم بالخصوص مطلوب ہیں اس لیئے خدا کا قرب حاصل کرنے کے لیے خوشی سے نیکی کرتے ہوئے جانور کے ذبح کرنے کو قربانی کہا جاتا ہے۔ اگرچہ قربانی کسی وقت بھی دی جا سکتی ہے۔ نذر کے طور پر بھی، اور اپنے شوق سے بھی لیکن اصطلاحی قربانی جو اس وقت ہمارے موضوع کی بنیاد ہے وہ ایام تشریق کی قربانی ہے۔

البتہ احادیث میں قربانی کے مفہوم کے لیئے ایک اور لفظ "اُضْحِيَّة" [1] معروف ہے

[1] اس کا ضبط یوں ہے: بضم الهمزة وكسرها وتشديد الياء، قال النووي في شرح المسلم "الاضحية على اربع لغات (باقی آگے)

مراد وہ جانور ہیں جو کہ ذبح کیے جاتے ہیں۔

قربانی کی اہمیت

اس کی مشروعیت میں امتِ مسلمہ کے علماء و فقہا کا اجماع ہے، کتاب اللہ میں جس کی بنیاد مفسرین کے نزدیک خداوند تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔

"فصلّ لربك وانحر"

"کہ تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور قربانی دے" (الکوثر) یعنی عیدین کی نماز پڑھ اور قربانی دے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ یہ سنت ہے یا کہ واجب؟

امام مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ، ابو یوسفؒ اور محمدؒ کے نزدیک یہ سنت مؤکدہ ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مقیم شہریوں پر واجب ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اپنی تمام مدتِ اقامت میں جو کہ دس برس پر محیط ہے، اس میں ہمیشہ قربانی کی۔ اور بعض احادیث میں وارد ہے کہ "جس شخص نے عید سے پہلے ذبح کر دیا (اس کی مطلوبہ قربانی نہیں ہوئی)، اسے اس کی جگہ ایک اور ذبح کرنا چاہیے" اور اعادہ کا امر صرف واجب پر ہی ہو سکتا ہے۔[1]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے کسی آدمی نے سوال کیا کہ قربانیاں کیا واجب ہیں؟ تو جواباً ارشاد فرمایا کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اور مسلمانوں نے قربانی کی ہے" اس نے دوبارہ بھی سوال اٹھایا تو پھر یہی ارشاد فرمایا۔ "کیا تو سمجھ سکتا ہے کہ رسول خدا نے بھی قربانی دی اور دوسرے مسلمانوں نے بھی قربانی دی"[2]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ جو شخص استطاعت کے باوجود قربانی نہ دے وہ ہماری جائے نماز کے قریب نہ آئے۔ ابن ماجہ نے اسے مرفوعاً یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے ارشادات میں

وھی اسم للمذبوح یوم النحر (۱) اُضْحِيَة (۲) اِضْحِيَة۔ دونوں کی جمع اَضَاحِي ہے (۳) ضَحِيَّة جمع ضحایا (۴) اِضحاۃ بفتح الہمزہ (جمع) اَضْحیٰ کا ارطاۃ اور ارطی وبہا سمی یوم الاضحیٰ۔

[1] ملاحظہ ہو حاشیہ مشکوٰۃ المصابیح ج ۱، ص ۱۲۷، بحوالہ المرقاۃ ملا علی قاری۔ [2] رواہ الترمذی وحسنہ کذا فی سنن الترمذی

[3] بحوالہ اعذب الموارد فی تخریج جمع الفوائد ج ۱، ص ۵۳۶۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ فرض، واجب اور سنت وغیرہ کی تقسیم میں شدت اختیار کرنا دراصل شرعی احکام میں ضعف پیدا کرنا ہے اگر کوئی سنت کا شیدائی ہو تو اسے یہ تقسیم کبھی پسند نہ ہوگی۔ واللہ اعلم

شمار کیا ہے۔ امام احمد اور حاکم بھی اسے مرفوع ہی شمار کرتے تھے البتہ دوسرے ائمہ نے اسے حضرت ابوہریرہ کا قول شمار کیا ہے۔ البتہ سند کے راوی ثقہ ہیں۔ اگر یہ حضرت ابوہریرہؓ کا قول بھی ہو تو بھی اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص بھی استطاعت کے باوجود قربانی سے گریزاں ہے اور وجوب و سنت کی تقسیم سے فائدہ اٹھا کر معافی چاہتا ہے وہ دراصل سنتِ ابراہیمی کی اہمیت کو ختم کرنا چاہتا ہے اور یہ اس کے ایمان میں خلل کا سبب بن سکتا ہے ایسے آدمی کو عید کی نماز پڑھنے سے روک دیا جائے تاکہ وہ دوسروں کے لیے عبرت بن سکے۔ اور خود بھی اپنا مقام پہچان لے کہ مسلمانوں کی حقیقی خوشی میں وہ شریک نہیں ہو سکتا واللہ اعلم

مطلوبہ قربانی کے اوصاف

قربانی کے اوصاف معلوم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے ایجابی اور سلبی دونوں پہلو معلوم ہو سکیں۔ ایجابی سے مراد یہ ہوگا کہ قربانی ایسی ہونی چاہیے اور سلبی سے مراد یہ ہے کہ قربانی ایسی نہیں ہونی چاہیے۔ چونکہ قربانی کے سلبی پہلو اپنی کثرت کے باوجود شمار کیے جا سکتے ہیں۔ اور ایجابی پہلو لاتعداد یا کثیر التعداد ہوں گے اس لیے اگر سلبی پہلو معلوم ہو جائیں تو ایجابی پہلو بھی فوراً سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ اس لیے ہم سلبی پہلوؤں میں ان کے عیوب پہلے ذکر کریں گے۔ واللہ الموفق

کان کا عیب

"امرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نستشرف العین والاذن وان لا نضحی بمقابلۃ ولا مدابرۃ ولا شرقاء ولا خرقاء" (احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، دارمی، امام ترمذی اسے صحیح کہتے ہیں ابوداؤد اور منذری نے کوئی جرح نہیں کی، نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۲۴)

ترجمہ: "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ ہم کان اور آنکھ کو غور سے دیکھ لیں۔ یہ کہ ہم ایسے جانور کی قربانی نہ کریں جس کا کان سامنے سے کٹا ہو یا پیچھے سے کٹا ہو۔ یا چیرا ہوا ہو یا سوراخ والا کان ہو۔"

تو کان کا کوئی عیب جو کہ واضح طور پر بدنمائی پیدا کر رہا ہو قربانی میں نقص پیدا کر دے گا۔ ہاں اگر غیر نمایاں اور معمولی ہو تو پھر کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ ابوالولید کہتے ہیں۔

"انما نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المصفرۃ ...... الحدیث[1]"

اور "مصفرۃ" کی تشریح میں مجمع البحار ج ۲ میں لکھا ہے:

---

[1] رواہ احمد والبخاری فی تاریخہ والحاکم وسکت عنہ ابوداؤد والمنذری کذا فی النیل ۵/۱۲۴۔ بحوالہ اعذب الموارد فی تخریج جمع الفوائد۔ ج ۱۔ ص ۵۳۸

"والمصفرة قيل اى المستا صلة الاذن لان صماخيها صفر عن الاذن اى خلوا"

کہ "مصفرۃ" سے مراد جڑ سے کاٹی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس کے کانوں کی نچلی جگہ کانوں سے صفر (خالی) ہوتی ہے" واللہ اعلم

ان دونوں حدیثوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کان کا نمایاں عیب تو قربانی میں نقص ڈالے گا۔ لیکن معمولی عیب ہو تو کوئی حرج نہیں۔ واللہ اعلم

آنکھ کا عیب

"عن البراء بن عازب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سئل ماذا یتقی من الضحایا فاشار بیدہ فقال اربعا ......

الی ان قال العوراء البین عورھا" - الحدیث[1]

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کون سی قربانیوں سے پرہیز کی جائے تو آپ نے چار چیزیں شمار فرمائیں۔ اور منجملہ ان چار چیزوں کے یہ بھی فرمایا۔ کہ بھینگی جس کی آنکھ کا عیب ظاہر ہو۔" واللہ اعلم

سینگ کا عیب

ابو الولید کی مذکورہ حدیث میں جہاں کان کا عیب ذکر ہوا ہے وہاں "المستاصلۃ" بھی مذکور ہے جس کی تفسیر انہوں نے "التی استوصل قرنھا من اصلہ" "کہ جس کا سینگ جڑ سے کٹ گیا ہو" کی ہے۔

"عن علی رضی اللہ عنہ قال نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نضحی باعضب القرن والاذن" (ابن ماجہ)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ ہم اندر سے ٹوٹے ہوئے سینگ یا چرے ہوئے کان والی کی قربانی کریں"

ٹانگ کا عیب

براء بن عازبؓ کی مذکورہ بالا حدیث جو کہ آنکھ کے بیان میں گزر چکی ہے اس میں ایک لفظ یہ بھی تھا "والعرجاء البین عرجھا" "لنگڑی جس کا لنگ نمایاں ہو" کہ یہ نمایاں عیب بھی قربانی میں نقص ڈال دے گا۔ گویا معمولی لنگ جو چلتے وقت پورا ظاہر نہ ہوتا ہو اس کی قربانی کرنے میں

[1] مالک، احمد، ترمذی، ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ، دارمی، اور امام مالک کا مرفوعاً روایت کرنا اس کی صحت کی دلیل ہے۔ واللہ اعلم

کوئی حرج نہیں۔ ابوداؤد کی ایک روایت میں "کسراء" بھی مذکور ہے یعنی جس کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی ہو۔[1]

مرض اور کمزوری کا عیب

اسی مذکورہ بالا حدیث میں، جو حضرت براء بن عازب سے مروی ہے، دو لفظ اور بھی وارد ہیں۔

"وَالْمَرِيضَةُ الْبَيِّنُ مَرَضُهَا وَالْعَجْفَاءُ الَّتِي لَا تُنْقِي"

"مریض جس کی مرض بالکل نمایاں ہو اور کمزور جس کی ہڈیوں میں مخ دکھائی نہ دے" ایک روایت میں "وَالْمُشَيَّعَةُ" بھی ممانعت میں داخل ہے۔

مشیعہ سے مراد ایسی قربانی لی گئی ہے جو کہ اپنے گلہ کے ساتھ کمزوری اور لاغری کی وجہ سے چل نہ سکے۔ گویا اگر وہ گلہ کا ساتھ دے سکے تو وہ کمزوری زیادہ نقصان دہ نہیں۔

پس معلوم ہوا کہ عیوب میں کان، آنکھ، سینگ اور ٹانگ کے نمایاں عیوب کے علاوہ شدتِ امراض اور سخت کمزوری بھی داخل ہیں۔ تو گویا اس کے علاوہ اگر کوئی اور عیب پایا جائے تو وہ قربانی میں نقص نہیں ڈالے گا۔

ایسے عیوب جو کہ اثر انداز نہیں ہوتے

مندرجہ ذیل حدیث میں ایسے عیب کی طرف اشارہ ہے جو کہ اثر انداز نہیں ہے۔

"(یزید ذو مصر) اتیت عتبۃ بن عبد السلمی فقلت لہ یا ابا الولید انی خرجت التمس الضحایا فلم اجد شیئا یعجبنی غیر ثرماء فکرھتھا فما تقول؟ قال أفلا جئتني بها؟ قلت سبحان الله تجوز عنك ولا تجوز عني قال نعم إنك تشك ولا أشك انما نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن المصفرة ...... الحديث"[2]

ترجمہ: "یزید ذو مصر کا کہنا ہے کہ میں عتبہ بن عبد سلمی کے پاس آیا اور کہا اے ابو الولید (عتبہ

---

[1] ابوداؤد کی یہ روایت پہلے بھی ابو الولید کی روایت سے گزر چکی ہے جسے امام احمد اور امام بخاری نے اپنی تاریخ میں ذکر کیا ہے، ابوداؤد اور منذری نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا نیل الاوطار ۵/۱۲۴ بحوالہ اعذب الموارد فی تخریج جمع الفوائد ج ۱ ص ۵۲۸۔

[2] یہ حدیث بھی گزر چکی ہے اسے ابوداؤد کے علاوہ احمد و بخاری نے "فی تاریخہ" روایت کیا ہے۔ ابوداؤد اور منذری نے سکوت فرمایا ہے۔ نیل الاوطار سے یہ کلام عبداللہ ہاشم مدنی نے ذکر کی ہے "اعذب الموارد فی تخریج جمع الفوائد ج ۱ ص ۵۲۸"

کی کیفیت ہے، میں قربانی کے جانور تلاش کرنے نکلا تھا لیکن مجھے کوئی پسندیدہ چیز نہیں ملی، سوائے ایک قربانی کے جانور کے جس کے دونوں دانت ٹوٹے ہوئے ہیں تو مجھے تو پسند نہیں آئی تمہارا کیا خیال ہے. تو جواباً کہا "اگر یہ بات تھی تو میرے لیے کیوں نہیں لے آیا"؟ انہوں نے ازراہ تعجب سوال کیا "سبحان اللہ! میرے لیے تو جائز نہیں تھی تو تمہارے لیے کیسے جائز ہو گئی؟" انہوں نے کہا "ہاں یہ درست ہے. کیونکہ تجھے اس کے جائز ہونے میں شک ہونے لگا اور مجھے چونکہ اس کے جواز میں کوئی شک نہیں اس لیے میرے لیے جائز ہے. کیونکہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تو کان کاٹے ہوئے .... وغیرہ وغیرہ سے منع فرمایا ہے"

تو اس حدیث سے معلوم ہوا کہ دانتوں کا ٹوٹا ہونا اثر انداز عیب نہیں ہے. واللہ اعلم!

ایک دوسری حدیث کے مطابق

"حضرت ابو سعیدؓ کہتے ہیں کہ ہم نے قربانی کے لیے دنبہ خریدا تو ایک بھیڑیے نے اس کے پچھلے حصے پر حملہ کر دیا. نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہم نے سوال کیا تو آپ نے ہمیں قربانی کا حکم دیدیا"

اسی حدیث کی ایک اور روایت کے مطابق یہ سوال ہوا کہ "ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی بکری کا سوال کیا جس کی دم کٹ گئی تھی لیکن وہ قربانی میں دینا چاہتا تھا "تو فرمایا" قربانی دے لو"

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی وجہ سے اگر دنبے کی چکی یا بکری کی دم کٹ جائے تو قربانی ہو جائے گی. اگر حدیث ضعیف نہ ہوتی تو مسئلہ بالکل اٹل تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ حدیث دو طریق سے وارد ہونے کے باوجود سخت ضعیف[1] ہے.

---

[1] پہلے طریق سے جابر جعفی اور محمد بن قرظہ ہیں. اول الذکر کو تو استاد کی بددعا لگ گئی تو وہ موضوع روایات بنا بنا کر ثقات کے نام سے منسوب کرنے لگا. اس کی تمام روایات ساقط الاعتبار ہو گئیں. دوسرے کے بارے میں ایک جگہ حافظ ابن حجرؒ "غیر معروف" اور دوسری جگہ "مجہول" کہتے ہیں. بعض لوگ اگرچہ یہ کہتے ہیں کہ ابن حبان نے اس کو ثقہ کہا ہے. لیکن ابن حبان کی توثیق دو طرح کی ہے ایک تو تحقیقی توثیق اور دوسری توثیق یہ ہے کہ اس کا ضعف معلوم نہیں اور "ظن المومنین بانفسہم خیرا" کے ماتحت ہر مجہول العین اور مجہول الحال کی توثیق کر دیا کرتے ہیں اس لیے ابن حبان کی توثیق اس وقت قابل قبول ہوتی ہے جب کہ دوسرے محدثین اس پر جرح نہ کریں.

تیسرا عیب اس طریق میں یہ ہے کہ محمد بن قرظہ کا ابی سعید سے سماع ثابت نہیں ہے. گویا تدلیس کا بھی شبہ ہے.

دوسرے طریق میں سند کچھ اس طرح ہے "حماد بن سلمہ عن الحجاج بن ارطاۃ عن عطیہ عن ابی سعید" الحجاج بن ارطاۃ

(باقی آگے)

اوصاف ایجابی

اوصاف ایجابی سے مراد قربانی کے ثبت اوصاف ہیں۔

مذکورہ بالا بحث سے پوری طرح معلوم ہو گیا کہ جس قربانی کی آنکھ، کان، سینگ اور ٹانگ درست ہوں یا معمولی بھی اغیر نمایاں، عیب ہو وہ قابل قبول ہے۔ بشرطیکہ وہ کمزور اور بیمار نہ ہو۔ کمزوری بھی ایسی جو اسے ریوڑ کے ساتھ چلنے میں مانع ہو۔

باقی ان اوصاف میں پھر درجات ہوں گے جتنی قربانی اچھی ہو گی خوب صورت موٹی تازی اور ہر لحاظ سے بے عیب ہو گی اتنی ہی زیادہ اچھی ہو گی۔ بشرطیکہ وہ فخر و ریاء کے نظریے سے ذبح نہ کی جائے ہاں اگر فخر و مباہات کی وجہ سے اور لوگوں میں اپنی شہرت حاصل کرنے کے لیے قربانی کمائے گی۔ لا العیاذ باللہ تو ایسی قربانی قبول نہیں ہو گی۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ!

"انما یتقبل اللہ من المتقین"

مسنون اور افضل قربانی

"ابو امامۃ، رفعہ (قال قال رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم) خیر الاضحیۃ الکبش وخیر الکفن الحلۃ" للترمذی [1]

ترجمہ: "بہترین قربانی مینڈھا رچھترا) ہے اور بہترین کفن ایک رنگ کی دو چادریں ہیں (جسے جوڑا یا حلہ کہا جا سکتا ہے)"

حدیث اگر متکلم فیہ نہ ہوتی تو اس سے بڑھ کر کوئی اور مناسب حدیث نہیں تھی۔ اسی معنیٰ میں ترمذی میں ہی ایک اور ضعیف حدیث بھی مروی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

ضعیف ہے کیونکہ اس کے بارے میں بعض شدانہ باتیں بھی مروی ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ نے اس کے بارے میں کثیر الخطاء اور تدلیس کا عیب ذکر کیا ہے۔ پہلے بحث گذر چکی ہے کہ ایسی قربانی جس کا عیب نمایاں نہ ہو کوئی حرج نہیں۔ تو جو عیوب خواہ آنکھ، کان سینگ اور ٹانگ کے ہوں لیکن نمایاں نہ ہو بلکہ معمولی ہوں وہ قربانی میں رکاوٹ نہیں ڈالتے۔

[1] رواہ ایضاً ابن ماجۃ وقال الترمذی غریب وفیہ عفیر یضعف فی الحدیث کما آخرجہ (ایضاً) ابوداؤد وابن ماجۃ والحاکم عن عبادۃ بن الصامت وقال صحیح واقرہ الذہبی فی التلخیص ولکنہ فی المہذب قال فیہ ابوحاتم بن ابی نصر مجہول کذا فی ۲۶۹/۲ بحوالہ اعذاب الموارد ج ۱ص ۵۲۷۔

"نعم او نعمت الأضحية الجذع من الضأن"[1]

"بہترین قربانی جوان طاقتور مینڈھا ہے" حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

"ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر بکبش اقرن یطأ فی سواد و یبرك فی سواد و ینظر فی سواد فاتی به لیضحی به" ...... الحدیث

(لابی داؤد، مسلم بلفظہ)

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے سینگوں والے مینڈھے کے بارے میں ارشاد فرمایا جو سیاہی میں چلتا، سیاہی میں بیٹھتا، اور سیاہی میں دیکھتا تھا آپؐ کے پاس لایا گیا تاکہ اسے قربان فرمائیں"

سیاہی میں چلنے سے مراد اس کے ٹانگوں کا سیاہ ہوتا ہے۔ سیاہی میں بیٹھنے سے مراد اس کے نچلے حصے کا سیاہ ہونا ہے۔ اور سیاہی میں دیکھنے سے مراد اس کی آنکھوں کا سیاہ ہونا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ چھوٹی قربانی میں یہ اوصاف مسنون اور افضل ہیں۔ اگر کوئی ایسا جانور ذبح کرے گا تو اس کی قربانی افضل قرار دی جائے گی۔ بشرطیکہ مالِ حلال اور دل کی خوشی سے صرف خدا کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے کی جائے۔ والتوفیق بید اللہ!

ایک اور حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

"عن جابر رضی اللہ عنہ، ذبح النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الذبح کبشین اقرنین املحین موجوئین فلما وجههما قال انی وجهت ..... الحدیث" (الترمذی)[2]

ترجمہ:۔ "ذبح کیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کے روز دو مینڈھے سینگوں والے خصی شدہ اور ان کی سفیدی ان کی سیاہی سے زیادہ تھی جب ان کو قبلہ رخ کیا تو فرمایا۔

"انی وجهت ...... الحدیث"

ایک اور حدیث ملاحظہ ہو۔

"وابو سعید، کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یضحی بکبش اقرن فحیل ینظر فی سواد ویأکل فی سواد ویمشی فی سواد" (رواہ الترمذی وابو داؤد)[3]

---

[1] رواہ احمد ایضا وقال الترمذی غریب وقد روی مرفوعا وذکرہ ابن حجر فی التلخیص ولم یزد علی هذا کذا فی النیل ۱۲۲/۵۔ قال فی اعذب الموارد تخریج جمع الفوائد ج ۱ ص ۵۲، [2] رواہ ایضا ابن ماجۃ وفی اسنادہ محمد بن اسحاق وهو مدلس ۱۰۱/۴ [3] رواہ ایضا احمد وصححه ابن حبان وهو علی شرط مسلم قال صاحب الاقتراح (باقی اگلے صفحہ پر)

ترجمہ: "تھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کرتے ایک مینڈھے کی جو سینگوں والا فحل تھا اس سے مراد وہ مینڈھا ہے جو نسل کشی کے لیے رکھا جاتا ہے، جس کی آنکھیں سیاہ، منہ سیاہ اور پاؤں سیاہ تھے۔" یہ حدیث قابل حجت ہے۔

مزید ملاحظہ فرمائیں

"النعمان بن ابی فاطمۃ انہ اشتری کبشا اقرن اعین وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم راٰہ فقال کان ھذا الکبش ذبح ابراھیم فعمد رجل من الانصار فاشتری للنبی صلی اللہ علیہ وسلم من ھذہ الصفۃ فاخذہ صلی اللہ علیہ وسلم فضحی بہ للکبیر"[1]

"نعمان بن ابی فاطمہ نے ایک مینڈھا خریدا جو سینگوں والا اور موٹی موٹی آنکھوں والا تھا نبی اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے دیکھا تو فرمایا "گویا کہ یہ مینڈھا وہ ہے جسے ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کیا تھا، یہ سن کر ایک انصاری اٹھا تو اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر ایسا ہی ایک مینڈھا خرید لیا تو آپؐ نے اسے لے کر قربانی دیا"

حدیث قابل حجت ہے کیونکہ راوی ثقہ ہیں۔

ان احادیث میں مسنون قربانی، جو کہ افضل بھی ہے، کا پتہ چلتا ہے۔ اگر حج کے موقعہ کو بھی نظر میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایام حج میں سو اونٹوں اور چند گایوں کی بھی قربانی دی ہے آگے حدیثیں آئیں گی ان شاء اللہ۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑی قربانی چھوٹی قربانی سے افضل ہے امام نوویؒ کے مطابق جمہور کا مسئلہ یہ ہے کہ سب سے افضل اونٹ پھر گائے پھر دنبہ یا بھیڑ وغیرہ پھر بکری۔ امام مالکؒ کے نزدیک بکری عمدہ گوشت کی وجہ سے افضل ہے۔ لیکن افضلیت کا دارو مدار موٹاپے اور عمدگی پر ہے۔ تو جس قدر قربانی "تسر النظرین" ہوگی وہ افضل ہوگی یعنی دیکھنے سے طبیعت خوش کرنے والی

---

[1] کذا فی النیل ۵/۱۳۶ وفی تحفۃ الاحوذی ۲/۱۰۱ رواہ ایضا النسائی وابن ماجہ وقال الترمذی حسن صحیح غریب لا نعرفہ من حدیث حفص بن غیاث. انتھٰی مافی اعذب الموارد قلت فی التقریب حفص بن غیاث رجلان احدھما ابن طلق بن معاویۃ النخعی ابو عمر الکوفی القاضی ثقۃ فقیہ تغیر حفظہ قلیلا فی الآخر من الثامنۃ والثانی شیخ میمون بن مھران مجھول من الثامنۃ والحدیث عند الترمذی لیس فیہ میمون بن مھران فھو الاول فالحدیث اذا قابل للاحتجاج واللہ اعلم

[2] ورجالہ ثقات کذا فی مجمع الزوائد ۵/۲۲۔

قربانی ہو تو افضل ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بکری یا دنبہ چونکہ ایک آدمی کی طرف سے ہوتا ہے، اگر گائے یا اونٹ بھی ایک ایک آدمی سے ہو تو وہ بہر صورت افضل ہوگا۔ واللہ اعلم

جانوروں کے حصص:۔ اونٹ اور گائے

(ابن عباس رضی اللہ عنہما)

"کنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی سفر فحضر الاضحیٰ فاشترکنا فی البقرۃ سبعۃ وفی البعیر عشرۃ" (للترمذی والنسائی)[1]

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سفر میں تھے کہ قربانی کے دن آ گئے تو ہم ایک گائے میں سات اور ایک اونٹ میں دس آدمی شریک ہوئے"

(جابر رضی اللہ عنہ) نحر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن نسائہ فی حجہ بقرۃ" وفی روایۃ نحر عن عائشۃ بقرۃ یوم النحر" لمسلم

"حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے حج میں اپنی عورتوں کی طرف سے ایک گائے ذبح کی اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے قربانی کے روز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔"[2]

ہو سکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے اکیلی گائے کی نذر مانی ہو اور انہوں نے کہیں اپنے ذریعے سے اس کی قیمت ادا کر دی ہو۔ یا پہلی روایت میں "بقرۃ بقرۃ" ہو کہ ہر عورت کی طرف سے ایک گائے ذبح کی۔ اس طرح حضرت عائشہ سے بھی ایک گائے ذبح ہو سکتی ہے۔ جیسے دوسری ازواج سے کی۔ اور یہ توجیہ زیادہ بہتر ہے۔

"عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ قال نحرنا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عام الحدیبیۃ البدنۃ عن سبعۃ والبقرۃ عن سبعۃ" (مسلم ج ۱ ص ۴۲۴)

"حدیبیہ کے سال ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک اونٹ سات آدمیوں کی طرف

---

[1] رواہ ایضا ابن ماجۃ واحمد وحسنہ الترمذی کذا فی النیل ۵/۱۰۴۔ [2] دراصل روایت مسلم ج ۱ ص ۴۲۴ یوں ہے "حدثنی محمد بن حاتم حدثنا محمد بن بکر اخبرنا ابن جریج ح وحدثنی سعید بن یحییٰ الاموی حدثنا ابی حدثنا ابن جریج اخبرنی ابو الزبیر انہ سمع جابرؓ بن عبد اللہ یقول نحر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن نسائہ وفی حدیث ابی بکر عن عائشۃ بقرۃ فی حجتہ" تو اس سے معلوم ہوا کہ صاحب جمع الفوائد کے اختصار میں تسامح ہے۔ روایت کے ان الفاظ میں بالکل کوئی اشکال نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

سے اور گائے سات آدمیوں کی طرف سے ذبح کی "

ایک اور روایت ملاحظہ ہو۔

"عن جابر قال خرجنا مع رسول الله صلی الله علیه وسلم مهلین بالحج فامرنا ان نشترک فی الابل والبقر کل سبعة منا فی بدنة"

" حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ہم نکلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ حج کی تلبیہ کہنے والے، تو آپ نے ہمیں حکم دیا کہ اونٹ اور گائیوں میں شریک ہو جائیں ہم میں سے ہر سات آدمی ایک قربانی میں "

ان احادیث کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ صرف اونٹ اور گائے میں شراکت ہو سکتی ہے امام شافعی اور ابو حنیفہ دونوں کے نزدیک اونٹ اور گائے میں شراکت ہو سکتی ہے اگرچہ بعض کے ہاں یہ تفصیل پائی جاتی ہے کہ اگر کسی پر واجب قربانی ہو تو ان کے ساتھ نافلہ قربانی والا شریک نہیں ہو سکتا لیکن بالجملہ شراکت میں اتفاق ہے اور اس پر بھی علمائے امت کا اجماع ہے کہ مینڈھے اور بکری میں بھی ایک ہی قربانی شمار کی جائے گی۔ یا ایک عائلہ (چھوٹا خاندان) زیادہ سے زیادہ اس کے ثواب میں شریک ہو سکے گا، باقی بقول ابن رشد اس میں بھی اجماع علمائے امت ہے کہ گائے ہو یا اونٹ حصے اس میں سات ہی ہوں گے۔ کیونکہ کسی مجتہد سے اونٹ میں دس کے بارے میں روایت منقول نہیں۔ چنانچہ اس کی عبارت ملاحظہ ہو۔

"واجمعوا انه لا یجوز ان یشترک فی النسک اکثر من سبعة وان کان قد روی من حدیث رافع بن خدیج ومن طریق ابن عباس وغیرہ والبدنة عن عشرة"

وقال الطحاوی "واجماعهم علی انه لا یجوز ان یشترک فی النسک اکثر من سبعة دلیل علی ان الآثار فی ذلک غیر صحیحة"

"اس بات پر اجماع ہے کہ بڑی قربانی میں سات سے زیادہ حصہ دار نہیں ہیں۔ اگرچہ رافع بن خدیج اور ابن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہ کے طریق سے اونٹ میں دس حصوں کا ذکر آتا ہے۔ امام طحاوی کا کہنا ہے علمائے امت کا اجماع ہے کہ بڑی قربانی میں سات سے زیادہ حصہ دار نہیں ہیں، یہ دلیل ہے کہ اس بارے میں جو روایات منقول ہیں (کہ دس حصے ہو سکتے ہیں) وہ ضعیف ہیں۔

بہر حال اگر کسی زمانہ میں اجماع اس مسئلہ میں ثابت ہو چکا ہے کہ اونٹ میں بھی سات حصوں سے

زیادہ جائز نہیں تو پھر تو واقعی امام طحاوی کی بات صحیح ہے لیکن اگر اجماع سکوتی ہو یا اجماع غیر یقینیؒ ہو تو اونٹ کے بارے میں روایات بھی کم از کم قابل احتجاج تو ضرور ہیں۔ ہاں اگر احتیاط کرے تو سات ہی رکھے کیونکہ مسلم کی روایات میں اونٹ اور گائے دونوں میں سات سات شریکوں کا ذکر ہے۔ واللہ اعلم

جانوروں کی عمریں۔

"عن جابر رضی الله عنه قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم لاتذبحوا الامسنة الاان یعسر علیکم فتذبحوا جذعة من الضان" رواہ مسلم

"حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دوندا (یعنی جس کے دو دانت اگ چکے ہوں) ہی ذبح کرو الایہ کہ تمہیں نہ ملے تو اس صورت میں بھیڑ ول میں جوان طاقت ور ذبح کر لو"

ابن رشد رحمۃ اللہ علیہ "بدایۃ المجتہد" میں فرماتے ہیں۔

"اجمعوا علی انہ لایجوز الجذع من المعز بل الثنی فما فوقہ لقولہ علیہ الصلاۃ والسلام لابی بردۃ لما امرہ بالاعادۃ "یجزیک ولایجزی جذع عن احد غیرک" واختلفوا فی الجذع من الضان فالجمہور علی جوازہ" الخ

"اجماع ہے کہ بکریوں میں سے نوجوان لیلا جائز نہیں جب تک کہ دو دانت نہ اگ آئیں کیونکہ ابو بردہؓ کو جب آپؐ نے دوبارہ قربانی کا ارشاد فرمایا اور اس کے پاس دو دانت والا بکرا نہیں تھا تو فرمایا کہ لیلا ہی ذبح کر لو لیکن تیرے بعد کسی دوسرے کو جائز نہیں کہ وہ لیلا ذبح کرے۔ البتہ بھیڑ کے نوجوان بچھوڑے کے متعلق اختلاف ہے۔ جمہورؒ تو جائز قرار دیتے ہیں لیکن چند علماء نے اس میں ممانعت بھی کی ہے

۱؎ حاشیہ مشکوٰۃ کے مطابق محدث دہلویؒ نے ذکر کیا ہے کہ بعض علماء نے اس پر عمل کیا ہے لیکن جمہور کا مسلک اس کے خلاف ہے تو معلوم ہوا کہ یہ اجماع غیر یقینی ہے۔ واللہ اعلم ۲؎ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ "لاتذبحوا الا مسنۃ" کے ماتحت فرماتے ہیں۔

"قال العلماء المسنۃ ھی الثنیۃ من کل شیئ من الابل والبقر والغنم فما فوقہا وھذا تصریح بانہ لا یجوز الجذع من غیر الضان فی حال من الاحوال وھذا مجمع علیہ علی ما نقلہ القاضی عیاض ونقل العبدری وغیرہ من اصحابنا عن الاوزاعی انہ قال یجزی الجذع من الابل والبقر والمعز والغنم وحکی ھذا عن عطاء واما الجذع من الضان فمذھبنا ومذھب العلماء کافۃ انہ یجزی سواء وجد غیرہ ام لا وحکوا عن ابن عمر والزہری انہما قالا (باقی اگلے صفحہ پر)

کھیرا دنبہ یا مینڈھے کی عمر

مذکورہ بالا بحث میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ دنبہ ہو یا مینڈھا وہ کھیرا دیا جا سکتا ہے جب کہ وہ طاقت ور اور جوان ہو تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی عمر کا کیا اندازہ ہے؟ بعض لوگ اسے ایک سال مکمل کا بتاتے ہیں، کچھ لوگ چھ ماہ کا بھی کہہ دیتے ہیں کچھ آٹھ ماہ اور کچھ دس ماہ کا شمار کر لیتے ہیں۔ لیکن جو چھ ماہ کہتے ہیں وہ شاید یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ وہ جوان ماں باپ سے پیدا ہوا ہو ورنہ آٹھ ماہ کا جب کہ وہ بوڑھے ماں باپ کی اولاد ہو۔

لیکن اگر ہم اس عمر کے ساتھ اس کی قوت اور طاقت کے علاوہ اس کی جسمانی ساخت و موٹاپے کا بھی لحاظ کریں تو صرف عمر ہی اس کی تعیین کے لیے کافی نہیں بلکہ دوسرے اوصاف کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔ بلکہ وہ عمر سے زیادہ اہم ہیں۔ واللہ اعلم

جانوروں کی تعیین

کون کون سے جانور قربانی میں دیے جا سکتے ہیں؟ امام نووی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

"و اجمع العلماء علی انہ لا تجزی الضحیۃ بغیر الابل والبقر والغنم الا ما حکاہ ابن المنذر عن الحسن بن صالح انہ یجوز التضحیۃ ببقرۃ الوحش عن سبعۃ وبالظبی عن واحد وبہ قال داؤد فی بقرۃ الوحش" واللہ اعلم!

لو یجزی وقد یحتج لھا بظاھر ھذا الحدیث۔

قال الجمھور ھذا الحدیث محمول علی الاستحباب والافضل وتقدیرہ یستحب لکم ان لا تذبحوا الا مسنۃ فان عجزتم فجذعۃ ضأن ولیس فیہ تصریح بمنع جذعۃ الضأن وانھا لا تجزی بحال وقد اجمعت الامۃ علی انہ لیس علی ظاھرہ لان الجمھور یجوزون الجذع من الضأن مع وجود غیرہ وعدمہ وابن عمر والزھری یمنعانہ مع وجود غیرہ وعدمہ فتعین تاویل الحدیث علی ما ذکرنا من الاستحباب" واللہ اعلم!

خلاصہ اس کلام کا یہ ہے کہ "مسنہ" کی شرط اونٹ، گائے کے علاوہ بکریوں پر بھی لاگو ہے۔ قاضی عیاض کے مطابق اس پر اجماع امت ثابت ہو چکا ہے کہ اس سے کم عمر والا سوائے بھیڑوں کے کوئی اور جانور قربانی میں جائز نہیں ہوگا۔ حضرت جابرؓ کی مذکورہ حدیث سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر دو دندا ملے تب ہی بھیڑوں اور دنبوں میں سے کھیرا جائز ہے ورنہ جائز نہیں لیکن امام نوویؒ نے مندرجہ بالا عبارت میں تصریح کی ہے کہ اس حدیث کا یہ مفہوم معتبر نہیں ہے کیونکہ اس ظاہری مفہوم پر امت بھر میں کسی کا بھی فتویٰ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے (باقی آگے)

"علمائے امت کا اجماع ہے کہ قربانی؎ اونٹوں، گائیوں اور بھیڑ بکریوں کے علاوہ کسی اور چیز کی دینی جائز نہیں ہے۔ ہاں جو کہ ابن المنذر نے حسن بن صالح سے روایت کیا ہے کہ نیل گائے سات آدمیوں کی طرف سے اور ہرن ایک آدمی کی طرف سے قربانی ہو سکتی ہے اور یہی قول داؤد نے نیل گائے کے بارے میں کہا ہے۔ واللہ اعلم!

تو اس سے معلوم ہوا کہ اونٹوں، گائیوں اور بھیڑ بکریوں کے علاوہ قربانی کسی اور جانور کی بھی جائز نہیں کیونکہ اگر صدر اول میں کوئی بات خلاف واقع بھی ہو اور بعد میں علمائے امت کا اجماع ثابت ہو جائے تو وہ اجماع حجت ہوگا نہ کہ صدر اول کا اختلاف۔ تو اختلاف کی آڑ میں اجماع کی مخالفت جائز نہیں ہوگی۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن علمائے متاخرین نے فضیلت جمعۃ المبارک سے مرغ اور انڈے وغیرہ کی قربانی کا جواز حاصل کیا ہے وہ عیدین کی قربانی کا مدعا پورا نہیں کرے گا۔ کیونکہ اگر عیدین کے لیے یہ قربانیاں جائز ہوتیں تو سب سے پہلے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان نادار صحابہؓ کو تعلیم فرماتے جو کہ ایک بکری تک بھی خریدنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ نیز چونکہ اجماعِ امت نے جانوروں کی تعیین بھی کر دی نیز مرغ اور انڈے کے بارے میں متقدمین میں سے کسی ایک کا عمل نہیں رہا کہ اس نے عیدین کے روز دوسرے جانوروں کو چھوڑ کر یا ان کے ساتھ یہ بھی قربانی میں پیش کیے ہوں۔ اگرچہ مفہوم حدیث زیر بحث کے لحاظ سے قربانی کا لفظ مرغ اور انڈے پر وارد ہے تاہم وہ قربانی عیدین کے علاوہ کسی دوسرے موقع پر بھی محمول ہو سکتی ہے اور واقعی اگر کوئی شخص اللہ کے لیے چھوٹی سی بھی قربانی پیش کرے خواہ وہ انڈے سے بھی کم درجے کی ہو تو وہ بھی قابل قبول ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

"فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ"

"جو بھی ذرہ بھر نیکی کرے گا وہ اسے دیکھ لے گا" واللہ اعلم!

علاوہ ازیں قرآن مجید میں، قربانی کے بیان میں "بھیمۃ الانعام" اور "البدن" مذکور ہے۔

کہ وہ زیادہ افضل اور مستحب ہے اگر نہ ملے تو بھیڑوں اور دنبوں سے کھیرا قربانی میں دیا جا سکتا ہے۔" واللہ اعلم

؎ معجم الفاظ القرآن الکریم کے مطابق:

"النعم فی اصل وضعھا الابل سمیت بذلک لنعومۃ مشیھا ولینہ ولانھا عند العرب اجل النعم وقد یتوسع فی النعم فیقال للابل والبقر والغنم اذا ارید جماعۃ الاصناف الثلاثۃ فیقال، تجب الزکوٰۃ فی النعم ولا یقال للبقر وحدھا ولا للغنم وحدھا نعم، و جمع النعم نعمان وانعام فالانعام فی الاصل الابل ویقال للابل والبقر والغنم انعام علی التوسع"

باقی آگے

جس سے مراد بے زبان چار پائے اور اونٹ وغیرہ ہیں۔

اہل لغت کے نزدیک مذکورہ بالا دونوں چیزیں (مرغ اور انڈا) "بہیمۃ الانعام" میں داخل نہیں ہیں کیونکہ انعام کے لیے چار ٹانگوں کا ہونا ضروری ہے جس کے "پر" نہ ہوں۔ لیکن جس کے پر بھی ہوں اور ٹانگیں بھی دو ہوں وہ پرندوں میں شامل ہے الا یہ کہ وہ اونٹ جیسے پاؤں رکھتا ہو تو اس وقت بھی اسے شتر مرغ ہی کہیں گے یعنی ایک لحاظ سے شتر (اونٹ) دوسرے لحاظ سے مرغ (یعنی پرندہ) مگر شتر مرغ کے متعلق کسی کا بھی خیال نہیں کہ وہ قربانی میں دیا جا سکتا ہے۔ اس لیے وہ خارج از بحث ہے۔ واللہ اعلم

ایام قربانی اور ان کی فضیلت

لغوی قربانی تو کسی وقت بھی اور کسی طرح بھی دی جا سکتی ہے لیکن اصطلاحی قربانی خاص ایام میں ہی دی جا سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"لیشهدوا منافع لهم ویذکروا اسم الله فی ایام معلومات علی ما رزقهم من بهیمة الانعام فکلوا منها واطعموا البآئس الفقیر"

ترجمہ:۔ "تاکہ وہ اپنے منافع کو حاضر ہوں اور جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو چوپائے دے رکھے ہیں ان پر معین ایام میں اللہ تعالیٰ کا نام لیں"

تو معلوم ہوا کہ حج کی قربانی کے لیے تو دن مقرر ہیں تو جو شخص اپنے گھر میں بیٹھ کر قربانی کرنا چاہتا ہے کیا اسے بھی ان ایامِ معلومہ (معین دنوں) کا حساب رکھنا پڑے گا یا کہ نہیں؟ اس کے بارے میں مندرجہ ذیل حدیث سے کچھ روشنی پڑتی ہے۔

---

* "وردالنعم والانعام فی الکتاب مرادا بہا الابل والبقر والغنم" "نعم" اصل وضع میں اونٹوں کے لیے مستعمل ہے اونٹوں کا یہ نام یا تو چال میں نرمی اور ملائمت کی وجہ سے ہے یا اس لیے کہ عرب کے نزدیک یہ سب سے بڑی نعمت تھی۔ کبھی "نعم" کے معنی میں وسعت پیدا کرتے ہیں تو اونٹوں، گائیوں اور بکریوں تینوں کے ریوڑ جب شمار ہوں تو یہ لفظ سب پر مشترکہ بول لیتے ہیں۔ جیسے کوئی کہے کہ "نعم" میں زکوٰۃ واجب ہے گویا تینوں ریوڑوں پر زکوٰۃ واجب ہے۔ اکیلی گائیوں پر "نعم" کا لفظ نہیں بولتے اور نہ ہی اکیلی بھیڑ بکریوں کو "نعم" کے مفہوم میں لاتے ہیں۔ نعم "کی جمع" نعمان "اور انعام ہے۔ تو معلوم ہوا کہ انعام بنیادی طور پر اونٹوں کے لیے مستعمل ہے اور علی سبیل التوسع تینوں (اونٹ، گائے، بھیڑ، بکریاں) پر بھی بولا جاتا ہے کتاب اللہ میں "نعم" اور "انعام" دونوں لفظ مستعمل ہیں۔ جن سے اونٹ، گائیں اور بھیڑ، بکریاں تینوں مراد ہیں۔

واللہ اعلم!

"البراء: ضحی خال لی یقال لہ ابو بردۃ قبل الصلوۃ فقال لہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم شاتك شاۃ لحم فقال یا رسول اللہ ان عندی داجنا جذعۃ من المعز قال اذبحھا ولا تصلح لغیرك ثم قال من ذبح قبل الصلاۃ فانما ذبح لنفسہ ومن ذبح بعد الصلاۃ فقد تم نسکہ واصاب سنۃ المسلمین للستۃ الا مالکا وفی روایۃ خطبنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی یوم نحر فقال لایذبحن" الحدیث

«حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا کہنا ہے کہ "میرے ایک ماموں نے نماز سے پہلے قربانی دی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا کہ تیری بکری، گوشت کی بکری شمار ہو گئی" گویا قربانی کے لیے نہیں شمار ہوئی۔ تو اس نے عرض کی۔ یا حضرت! میرے پاس ایک پالتو بکری بھی ہے جو کہ نوجوان ہے" آپ نے فرمایا "تو اس کو ذبح کر لیکن تیرے بغیر کسی اور کو اب کرنا جائز نہیں"، پھر ارشاد فرمایا کہ "جو شخص نماز سے پہلے ذبح کر لے تو اس نے اپنے لیے ذبح کیا ہے اور جو شخص نماز کے بعد ذبح کرے تو اس کی قربانی مکمل ہو گئی اور اس نے مسلمانوں کی سنت پالی" ایک روایت کے مطابق آپ نے یہ خطبہ قربانی کے روز دیا اس حدیث کو صحاح ستہ نے ذکر کیا ہے۔ البتہ مؤطا[1] امام مالک نے اس کو ذکر نہیں کیا۔»

اب اس کے آخری وقت کے بارے میں جستجو مطلوب ہے۔ والتوفیق بید اللہ!

"وعنہ (ای عن نافع) ان ابن عمر رضی اللہ عنہما قال الاضحی یومان بعد یوم الاضحیٰ وبلغنی عن علی مثلہ"

کہ "قربانیاں قربانی کے دن کے بعد دو دن اور ہیں اس طرح کا ایک قول حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی مجھے پہنچا ہے۔"[2]

---

[1] بعض علماء کے نزدیک ابن ماجہ کی بجائے مؤطا امام مالک صحاح ستہ میں شمار ہے۔ بعض مؤطا کی بجائے سنن دارمی کو اور بعض مسند احمد کو اور بعض منتقی ابن الجارود کو صحاح ستہ میں شمار کرتے ہیں ھکذا سمعتہ من شیخنا الالبانی حفظہ اللہ!

[2] اس سے یہ معلوم ہوا کہ عید الاضحیٰ (یوم النحر) کو بعد از خطبہ عید الاضحیٰ قربانی کا وقت شروع ہو گا جب کہ حاجیوں کے لیے بھی اسی روز قربانی شروع ہو گی۔ لیکن چونکہ حاجی لوگ عید نہیں پڑھ سکتے اور نہ ہی پڑھتے ہیں اس لیے ان کے لیے عید کے بعد کی قید نہیں ہے۔ بلکہ منیٰ میں پہنچ جانے کے بعد جو کام ان کے ذمے ہیں، ان میں قربانی بھی ہے جو کہ اصل ترتیب میں "رمی" کے بعد ذبح اور ذبح کے بعد حلق ہے لیکن سہواً یا مجبوراً، تقدیم و تاخیر معاف ہے۔ واللہ اعلم!

چنانچہ یہی قول مذکور امام مالکؒ نے اپنایا ہے۔ اسی قول کو امام ابو حنیفہؒ، احمدؒ اور علماء کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔

جب کہ امام شافعیؒ اور امام اوزاعیؒ کے نزدیک قربانی چار روز تک ہو سکتی ہے ایک قربانی کا روز اور تین روز اس کے بعد بھی!

اسی طرح کچھ شاذ اقوال میں مزید افراط و تفریط بھی ہے کسی نے تو قربانی کو صرف پہلے دن تک محدود رکھا ہے اور ایک دوسرے نے آخری ذی الحجہ تک قربانی کو جائز قرار دیا ہے۔ ابن رشد نے اس قول اخیر کو تو شاذ کہہ دیا ہے کہ اس کی کوئی وقعت نہیں البتہ یہ ضرور کہا کہ یہ تمام اقوال اسلاف سے مروی ہیں۔ مزید اگر چوتھے دن کی قربانی ثابت ہو جائے تو ہمیں دوسروں کے اقوال سے تعرض کی ضرورت نہیں جامع الصغیر میں سیوطی علیہ الرحمۃ ذکر کرتے ہیں۔

"کل عرفات موقف وارفعوا عن عرفۃ وکل مزدلفۃ موقف وارفعوا عن بطن محسر وکل فجاج منیٰ منحر وکل ایام التشریق ذبح" (رمز لاحمد والتصحیح)

"تمام عرفات میں وقوف ہونا جائز ہے البتہ وادی عرفہ سے دور رہو۔ مزدلفہ میں وقوف ہو سکتا ہے۔ لیکن بطن محسر سے دور رہو۔ منیٰ کے سارے رستے قربانی کے لیے ہیں اور تمام ایام تشریق میں (قربانی) ذبح ہو سکتی ہے۔"

سیوطی نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیوطی کی تصحیح کافی نہیں جب تک کہ دوسرے ائمہ تصدیق نہ کریں۔ اگر یہ حدیث صحیح ثابت ہو جائے تو اس میں کوئی خلاف نہیں رہتا کہ تمام ایام تشریق میں قربانی جائز ہے۔ اور ایام تشریق قربانی کے بعد تین دن ہیں۔ نیز حاجی پر قیاس کیا جائے تو قرآن مجید کی آیت اس کو بھی شامل ہے۔ واللہ اعلم۔

مقامِ قربانی

قربانی کہیں بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن امام کے لیے افضل یہ ہے کہ جہاں عید

---

[1] اگر لوگ بارش وغیرہ کی وجہ سے نمازِ عید مسجد میں ادا کریں تو پھر مسجد میں قربانی نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ایک تو نجس خون مسجد میں پھیلے گا اور دوسرے مسجد کے احترام کے منافی ہے کہ اس میں کسی جانور کو تکلیف بھی پہنچائی جائے چہ جائیکہ اسے محل امن میں ذبح کیا جائے۔ واللہ اعلم!

کی نماز پڑھے وہیں قربانی کرے۔ ذیل کی حدیث ملاحظہ فرمائیں۔

"نافع، ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کان ینحر او یذبح بالمصلی وکان ابن عمر یفعلہ (للابی داؤد والنسائی) وذکر فی الاعذب رواہ ایضاً البخاری وابن ماجہ کذا فی النیل ۵/۱۲۹)

"نافع کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عید کی جگہ ہی قربانی کر لیتے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ ایسا ہی کرتے تھے۔"

حدیث اگرچہ مرسل ہے لیکن اگر کسی صحابی کے فتویٰ یا فعل سے ثابت ہو جائے تو حدیث حکماً متصل شمار ہو گی۔ چونکہ یہاں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا فعل موجود ہے اس لیے یہ حدیث حکماً متصل ہے اور چونکہ "نیل الاوطار" کے مطابق اسے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ذکر کیا ہے اس لیے یہ حدیث صحیح بھی ہے اور قابل عمل بھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے فعل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ کام امام کے لیے خاص نہیں، بلکہ ہر مسلمان نماز کی جگہ قربانی کر سکتا ہے لیکن مقصد چونکہ قربانی کی اہمیت اور نماز کے بعد فوری ذبح کرنے کا ہے اس لیے امام کے لیے یہی مستحب ہے۔ واللہ اعلم!

قربانی کے متعلق متفرق مسائل و فضائل

ا۔ قربانی نہ کر سکنے والے کے لیے کیا حکم ہے؟

"عن عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امرت بیوم الاضحیٰ عیدا جعلہ اللہ لھذہ الامۃ قال لہ رجل یا رسول اللہ ارأیت ان لم اجد الا منیحۃ انثیٰ أنأضحی بھا قال لا ولکن خذ من شعرک واظفارک وتقص شاربک وتحلق عانتک فذلک تمام أضحیتک عند اللہ" رواہ ابو داؤد والنسائی۔

ترجمہ:۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ مجھے اضحیٰ کے روز کے متعلق حکم ملا ہے کہ اسے عید بنالوں، اسے اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے بنایا ہے۔ ایک آدمی کہنے لگا یا رسول اللہؐ آپ خبر دیں اگر مجھے برائے قربانی کچھ میسر نہ ہو سوائے کسی شیر دار دودھ دینے والی اونٹنی، گائے یا بکری کے تو کیا میں اسے ذبح کر دوں، جواب میں ارشاد فرمایا "ایسا نہ کرو، ہاں اپنے بال، اپنے ناخن اور اپنی مونچھیں کاٹ لو، اور زیر ناف بال مونڈ لو تو اسی سے تمہیں خدا کے ہاں مکمل قربانی کا ثواب مل جائیگا" واللہ اعلم!

ب۔ حجامت وغیرہ کے مسائل

"عن ام سلمۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہا قالت قال رسول

الله صلی الله علیہ وسلم اذا دخل العشر واراد بعضکم ان یضحی فلا یمس من شعرہ وبشرہ شیئا وفی روایۃ فلا یاخذن شعرا ولا یقلمن ظفرا" وفی روایۃ "من رأی ھلال ذی الحجۃ واراد ان یضحی فلا یاخذ من شعرہ ولا من اظفارہ" (رواہ مسلم)

ترجمہ: حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں، فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب عشرہ ذی الحجہ داخل ہو جائے (اور ایک روایت میں ہے جو ذی الحجہ کا چاند دیکھ لے) اور وہ قربانی کا ارادہ کرے تو اپنے بال اور اپنے ناخن نہ لے" دوسری روایت میں ہے "بال نہ لے اور ناخن نہ کاٹے"

ج۔ عشرہ ذوالحجہ میں نیکی کی مزید ترغیب

"عن ابن عباس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما من ایام العمل الصالح فیھن احب الی اللہ من ھذہ الایام العشرۃ" قالوا یا رسول اللہ! ولا الجھاد فی سبیل اللہ؟ قال ولا الجھاد فی سبیل اللہ الا رجل خرج بنفسہ ومالہ فلم یرجع من ذلک بشیئ" (رواہ البخاری)

"حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کوئی ایسا دن جس میں خدا کو عمل صالح زیادہ عزیز ہو وہ ان دس روز سے زیادہ افضل نہیں" انہوں نے عرض کی تو کیا جہاد فی سبیل اللہ بھی؟ (اگر دوسرے دنوں میں کیا جائے تو کیا وہ بھی ایسی فضیلت والا نہ ہوگا؟) تو فرمایا جہاد فی سبیل اللہ بھی ان ایام کی فضیلت کو نہیں پہنچ سکتا۔ مگر وہ شخص جو اپنا مال اور اپنی جان دونوں لے کر نکلا اور کچھ بھی واپس نہ لایا"

د۔ قربانی کی فضیلت

"عن عائشۃ رضی اللہ عنہا قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما عمل ابن آدم من عمل یوم النحر احب الی اللہ من اھراق الدم وانہ لیأتی یوم القیامۃ بقرونھا واشعارھا واظلافھا وان الدم لیقع من اللہ بمکان قبل ان یقع بالارض فطیبوا بھا نفسا" (رواہ الترمذی وابن ماجۃ)

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قربانی کے روز ابن آدم نے کوئی کام خدا کے نزدیک (قربانی کے) خون بہانے سے بہتر نہیں کیا اور وہ روز

قیامت ان سینگوں، بالوں اور پایوں کو لے کر حاضر ہوگا اور خون زمین پر گرنے سے پہلے خدا کے ہاں وہ ایک مقام حاصل کر لیتا ہے تو اس سے اپنے دلوں کو خوش رکھو۔"

آداب قربانی

ا۔ دل کا حضور

سب سے اہم چیز۔ اپنے دل کو خدا کی طرف متوجہ کرنا اور ذبیحہ کو خدا کی ملکیت سمجھ کر خدا کے راستہ میں، خدا کے حکم سے، خدا کے رسول ابراہیمؑ کی سنت کو زندہ کرنے کی نیت کرنا۔

ب۔ ذبیحہ کو آرام پہنچانے کی جگہ چھری تیز رکھنا کہ جان جلدی ہوا ہو جائے۔

"عن شداد بن اوس قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ کتب الاحسان علی کل شیئ فاذا قتلتم فاحسنوا القتلۃ واذا ذبحتم فاحسنوا الذبحۃ ولیحد احدکم شفرتہ ولیرح ذبیحتہ" (احمد، مسلم، اصحاب السنن)

"اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کر دیا ہے جب تم قتل کرو تو اچھی طرح، اور جب ذبح کرو تو اچھی طرح ذبح کرو اور چاہیے کہ ایک تمہارا اپنی چھری تیز رکھے اور ذبیحہ کو آرام پہنچائے"

ج۔ قبلہ رخ لٹانا

"عن جابر رضی اللہ عنہ قال ذبح النبی صلی اللہ علیہ وسلم یوم الذبح کبشین اقرنین املحین موجوئین فلما وجھھما .... (الحدیث) (احمد، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی)

"حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ذبیحہ کے روز دو مینڈھے دو سینگوں والے سفید سیاہی مائل اور خصی ذبح فرمائے تو جب ان کا چہرہ (قبلہ کے رخ کیا) تو ..... (حدیث طویل ہے)۔"

د۔ ذبح کرتے وقت دعا

مذکورہ بالا حدیث میں "فلما وجھھما" کے بعد ہے۔

"قال انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوات والارض علی ملۃ ابراھیم حنیفا وما انا من المشرکین ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العلمین لا شریک لہ وبذلک امرت وانا من المسلمین اللھم منک ولک عن محمد وامتہ بسم اللہ واللہ اکبر ثم ذبح (رواہ احمد و ابن ماجۃ والدارمی وفی روایۃ لاحمد وابی داؤد والترمذی" ذبح بیدہ وقال بسم اللہ واللہ اکبر اللھم ھذا عنی وعمن لم یضح من امتی)

" تو جب ان کو قبلہ رخ فرمایا تو پڑھا:

" تحقیق میں نے اپنا چہرہ اس ذات کی طرف پھیر لیا ہے جس نے زمین و آسمان تخلیق فرمائے ملت ابراہیمؑ حنیف پر، اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں میری نماز، میری قربانی، میری زندگی، میری موت، یہ سب خدا کے لیے ہیں جو سب جہانوں کا مالک ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور اسی کا مجھے حکم ملا ہے اور میں مسلمانوں سے ہوں۔ اے اللہ تجھ ہی سے اور تیرے ہی لیے، محمدؐ اور اس کی امت کی طرف سے، ساتھ نام اللہ کے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے۔ اور دوسری روایت کے مطابق:

" ساتھ نام اللہ کے اور اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے۔ اے اللہ یہ میری طرف سے اور ان کی طرف سے جنہوں نے میری امت سے قربانی نہیں دی "

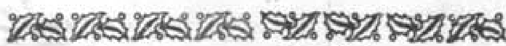
اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جس طرح اپنی طرف سے انسان قربانی کر سکتا ہے اسی طرح دوسرے کی طرف سے بھی قربانی کر سکتا ہے خواہ وہ اس دنیائے رنگ و بو میں موجود ہو یا غیر موجود۔ واللہ اعلم!

۴۔ درسِ عبرت

اس قربانی سے نہایت عظیم درسِ عبرت حاصل ہوتا ہے کہ جس طرح دوسری مخلوق اللہ کی امانت تھی اور اس کے راہ میں قربان ہو گئی اسی طرح مجھے بھی اپنے آپ کو اس طور تیار رکھنا چاہیے کہ خدا کے لیے اپنی جان کی قربانی میں کوئی فروگذاشت باقی نہ رہے تاکہ اگلی زندگی میں اس سے بخوشی ملاقات ہو سکے تو گویا ابدی مسرتوں کی دنیا کی ابتداء ہو گی۔ اسی سے مشرکین سے مومنین کو خداوند تعالیٰ نے امتیاز بخشا ہے۔ کہ وہ موت کو انتہاء سمجھتے ہیں اور مومن موت کو ابتداء سمجھتا ہے۔

وآخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العلمین

وصلی اللہ وسلم علی عبدہ ورسولہ محمد وآلہ واصحابہ اجمعین



Regd. No. L. 7895 Phones : 852897 - 63210

Monthly MOHADDIS Lahore-16

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

★ عناد اور تعصب قوم کے لیے زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں ____ لیکن تعصبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

★ علوم جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقا کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں ____ لیکن قدیم علوم اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

★ غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اقدار کے منافی ہے ____ لیکن دین اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سر انجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

★ تبلیغِ دین اور نشر و اشاعت اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے ____ لیکن حرام و حلال کے امتیاز میں رواداری برتنا اور قوانین و مسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی رُوح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

★ آئین و سیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے ____ لیکن

ع جُدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

★ جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اوصاف میں داخل ہے ____ لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔



اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو :

مُحدِّث

کا مطالعہ فرمائیے۔ آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزیّن ... کہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

...لانہ ۱۵ روپے

فی پرچہ ۱/۵۰ روپے